شعر و نغمات

Shair-o-Nagmaat.

فیاض (جے پوری)

(ب)

مصنّف :- فیاض احمد خاں فیاض جے پوری

ناشر :- فیاض احمد خاں فیاض " "

طابع :- رحیمی پریس۔ بمبئی ۸

پبلشر :- علوی بک ڈپو۔ محمد علی روڈ بمبئی ۳

تعداد اشاعت :- ایک ہزار

تاریخ اشاعت :- اپریل ۱۹۷۲ء

کتابت :- شفیق زاہدی

قیمت :- آٹھ روپے

فہرست

غزلیات:-

(د)

نظمیں :-

قطعات :-

پیش لفظ

"شعر و نغمات" کے مصنف، قدرت کی فیاضیوں کے مجسّم پرتوِ فیاض ہیں ان کی طبیعت اپنے تمام تاثراتِ سوزِ حیات کو سازِ دل کش کی صورت میں پیش کرنے کی ہمہ گیر صلاحیت کامل رکھتی ہے۔

اُن کا متبسم مگر گمبھیر چہرہ شاعرانہ قدرتِ فن کا ہنستا ہوا گلاب ہے۔ کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ اور پھر اپنی غزل، قطعات اور افکار کو جب آشنائے نغمہ کرتے ہیں تو لبِ جبریل کی ہر صدا ان کی ہم آواز ہو کر سُننے والوں کو نزولِ الہام کی کیفیات سے بہرہ ور کر دیتی ہے۔

میں نے اُن سے جو کچھ سُنا وہ خوب تر تھا۔ خدا انھیں اپنے فن کی طرح جاودانی قبولیت و عظمت عطا کرے۔

انور صابری

دہلی ۱۰ر مارچ ۱۹۷۲ء

شعر و نغمات کو دیکھکر

جناب فیاض خانصاحب فیاض جے پوری کے آبا و اجداد کا وطن خاص قصبہ کیرانہ ضلع مظفر نگر (یوپی) ہے۔ لیکن کسی وجہ سے وہ لوگ کیرانہ سے منتقل ہو کر عرصۂ دراز سے جے پور (راجستھان) میں مقیم ہو گئے۔ فیاض صاحب کے عم محترم استاد عبدالکریم خان صاحب کا شمار عظیم فن کاروں میں تھا۔ خود فیاض صاحب کے والد گرامی جناب عبدالبشیر خان صاحب بھی نامور اساتذہ میں سے تھے۔

فیاض صاحب کو موسیقی کی بھرپور تعلیم و تربیت اپنے والد گرامی ہی سے ملی۔ اس طرح یہ دولت بے پایاں گویا موصوف نے ورثے میں پائی۔

کچھ تو خاندانی خصوصیات و اثرات، کچھ ذاتی جوہر کامل اور فطری صلاحیت، ان چیزوں نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور فیاض صاحب بجائے خود مانے ہوئے فن کار اور دنیائے موسیقی کے ایک تابناک ستارے بن کے رہے۔ موسیقی سے طبعی مناسبت نے ان کو بے حد نکھار دیا۔ اس پر طرّہ یہ کہ اوائل عمری ہی سے شعر و شاعری سے بھی رغبتِ کاملہ رہی۔ ایک فن بہت سے فنون کی رہبری کرتا ہے۔ اور ایک علم بہت سے علوم کا معاون ہوتا ہے۔ چنانچہ جس طرح فنِ موسیقی کے لئے ان کو رہبرِ کامل خود ان کے بزرگ ملے تھے۔ اسی طرح شاعری میں رہنمائی کے لئے جناب حافظ

عزیز صاحب جے پوری کی ذاتِ گرامی میسّر آئی۔ حضرت عزیز حضرت آگاہ کے چہیتے شاگرد تھے اور حضرت آگاہ مرزا اسد اللہ خان غالب سے شرفِ تلمّذ رکھتے تھے۔ اس طرح شاعری کا شجرہ ان کو مرزا غالب کے آستانہ شعری تک پہنچاتا ہے۔

فنِ موسیقی میں عبور حاصل کرنے کے بعد بھی وہ صرف خاندانی دین پر ہی اکتفا نہ کر بیٹھے۔ بلکہ اپنے طور پر اس فن پر ریسرچ کرتے رہے اور ان کا ذوقِ تجسّس و تفحّص فن کے خزانے سے ان کو بہرۂ وافر بخشتا رہا۔

"ہونہار بروا کے چکنے پات" کے مصداق جن نعمتوں کو لوگ برسوں کی محنت شاقہ کے بعد بھی حاصل نہیں کر پاتے انھوں نے تھوڑے ہی دنوں میں پا لیا۔ تمام تر دشواریوں کو آسانیوں سے بدل ڈالنا اور برسوں کے مرحلوں کو ہفتوں میں طے کر لینا کوئی معمولی بات نہیں لیکن بہت سے خوش نصیب یونہی فائز المرام ہوتے ہیں۔ مبداء فیض نے فیاض صاحب کو ایسا ہی دل و دماغ دیا تھا۔ سچ ہے ع

این سعادت بزورِ بازو نیست

موصوف کا رخانۂ قدرت سے ایسا ہی دل و دماغ لے کر آئے تھے کہ چشم زدن میں منزل ہفتخواں طے کریں اور تھکیں نہیں۔ بہرۂ وافر حاصل کریں اور سیر نہ ہوں۔

درآنحالیکہ فنِ موسیقی وہ کوہِ بے ستون ہے جو تیشۂ فرہاد سے بھی کٹ کر جوئے شیر نہ بنے اور وہ بحرِ ناپیدا کنار ہے جس میں ہزارہا گرداب ہیں۔ لیکن طلب صادق کے سامنے "جوئے شیر" اور "گرداب" کا سینہ چیر کر ساحل پیدا کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اسی دنیا میں اور ہمیں انسانوں میں ہر دور میں کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہر دور میں پیدا ہوتے رہیں گے۔ مردانِ عالی ہمم اور عظمت و قوت کے پیکر سے ہماری دنیا کبھی خالی نہ رہی۔ فرق اتنا ہے کہ کچھ لوگ منصۂ شہود پر اُجاگر ہو جاتے ہیں اور خوش قسمت کہلاتے ہیں اور کچھ لوگ گوشہ نشینی اور گمنامی کے لئے مجبور کر دئے جاتے ہیں یا خود ہو جاتے ہیں اور ہم اُن کی یا اپنی بدنصیبی سے کہیں اُن کا نام نہیں سُنتے۔

الغرض اسی ذوقِ موسیقی نے رفتہ رفتہ فیاض صاحب کے دل و دماغ کو شاعری سے وابستہ رکھا۔ استاد کی رہنمائی نے ان کے ذوق کو جلا بخشی اور ان کی طبعی مناسبت بسرعتِ تمام ان کو آگے

بڑھاتی رہی۔ موسیقی کی لطافتوں اور نزاکتوں نے اِس فنِ لطیف میں بھی ان کی معاونت کی۔ ایک تو مشکِ خالص اُس پر طرّہ ہوائے سازگار۔ نکہت روح پرور پھیل پڑی اور بوئے گل دوشِ صبا پر جھکولے لینے لگی۔ مشقِ سخن بڑھتی گئی، دھنوں، آہنگ، ترنّم اور لہجوں میں زیر و بم پیدا ہوتا رہا اور اُن کی شاعری بھی تال میل کے کانٹے پر پوری اُترنے لگی۔ خصوصیت کے ساتھ ان کی شاعری ہلکی پھلکی مگر پُرآہنگ اور تابناک ترنّم کی لطافتوں کا مجموعہ بن گئی۔ وہ بہت ہی شگفتہ بحریں ڈھونڈتے ہیں اور بڑے بے تکلف اور والہانہ انداز میں، سادہ اور سلیس لہجے میں اپنا ما فی الضمیر اس طرح کہہ دیتے ہیں کہ سمجھنے والے کو کوئی اُلجھن نہیں ہوتی اور سُننے والے اسے اپنی ہی وارداتِ قلبی سمجھنے لگتے ہیں۔

اور ایمان کی پوچھئے تو وہی شاعری وجدانی اور ہمہ گیر اثرات سے بھرپور ہوتی ہے جس میں تصنّع، بناوٹ اور غیر ضروری ملمّاکاری نہ ہو۔ صنائع بدائع اگر آئیں بھی تو فطری طور پر آئیں۔ ٹھوسم ٹھوس الفاظ نہ ہوں۔ مغلق بندشیں نہ ہوں۔ عربی فارسی کے موٹے موٹے الفاظ اور نامانوس تراکیب نہ ہوں۔ یعنی لفظی صنّاعی اور بازی گری نہ ہو۔

فیاض صاحب کی شاعری کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے حد سادگی پسند ہیں۔ اور بڑی خوبی کے ساتھ گھریلو اور روزمرہ کی بول چال میں بڑی سے بڑی بات اس سادگی سے بے ساختہ کہہ جاتے ہیں کہ اُن کی سادگی ہی بہترین پُرکاری نظر آتی ہے۔ شعر شعر معلوم ہوتا ہے لفظوں کا گورکھ دھندا بن کے نہیں رہ جاتا۔

موصوف تغزّل کے شاعر ہیں۔ تغزل کی نزاکت نہ تو اہتمامِ لفظی کو سہار سکتی اور نہ ہی اپنی روایات و دوائر سے ہٹ سکتی ہے۔ اس التزام کو مدِنظر رکھنے میں فیاض صاحب عادی ہونے کی حد تک چابک دست ہیں اور ان کی غنائیت نے گراں گوشی اور سمع خراشی کے اشتباہ سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے۔

اس وقت اُن کا مجموعۂ کلام "شعر و نغمات" نگاہوں کے سامنے ہے۔ رسمی طور پر یہ کہہ دینا کہ "کتاب بہت اچھی ہے"، کوئی مشکل بات نہیں۔ فنّی طور پر اور شعری معیار پر جانچ کر یہ بات کہی جائے تو البتہ درست ہو سکتی ہے۔ اب آپ پوچھیں گے کہ شعری معیار کیا ہے تو پھر بات اور طویل و مشکل ہو جائے گی۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ اشعار کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: کچھ

اشعار جو مجھے پسند ہوں وہ ضروری نہیں کہ آپ کو بھی پسند ہوں اور جنھیں آپ پسند کرتے ہیں ضروری نہیں کہ مجھے بھی آئیں۔ اور یہی طبعی مخالفت یا موافقت ہے جو شعر کو کسوٹی پر کسنے میں بھی کارفرما ہوتی ہے بس ثابت ہوا کہ کوئی تنقید یا تبصرہ حرف آخر نہیں۔ تاہم عمومی پسندیدگی ہی کو ہم اچھی شاعری کہنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں خواہ اس کی علمی حیثیت بلند نہ سہی۔

زمانے کا مزاج بدلتا رہتا ہے اسی لئے علم و فن کا مزاج بھی زمانے کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ متقدمین کے زمانے میں اشعار پہلے عروضی حیثیت سے جانچے جاتے تھے پھر الفاظ و خیالات اور معانی و مطالب کے لحاظ سے۔ معائب، محاسن اور فنی نزاکتوں کی باتیں جو اس زمانے میں تھیں ممکن ہے آج بھی جزوی یا کلّی اعتبار سے وہی ہوں لیکن اندازِ بیان، اسلوب استدلال اور طریقہ تنقید بہت کچھ بدلا ہوا ہے اور مغربی سانچے میں ڈھل کر بہت وسیع ہو گیا ہے اور خود شاعری کا پیکر بھی جدید تراش خراش کے ملبوسات سے نئے ڈھنگ سے آراستہ ہو رہا ہے دریں احوال اگر متقدّمین کے معیار کو معیار کامل سمجھا جائے تب بھی بات نہ بنے گی اور متاخرین کے معیار کو معیار کامل قرار دیا جائے تب بھی بات نہ بنے گی۔ ہم جیسے بے بضاعتوں کے لئے صرف ایک ہی صورت قابلِ قبول ہے کہ شعر و نغمہ کو شعر و نغمہ ہی سمجھا جائے۔ قانون کی حیث و درست شق نہیں۔ دیکھا یہ جائے کہ اندازِ بیان گنجلک تو نہیں۔ آہنگ اور لہجہ کے لحاظ سے مترنم ہے یا نہیں۔ زبان صاف اور سلیس ہے یا نہیں۔

تو پھر مجھے کہنے دیجئے کہ فیاض صاحب کی پوری کتاب اور بتمامتر شاعری نغمات و آہنگ خیالات و لہجہ اور ترنم و تغزّل کے اعتبار سے بھر پور ہے اور بھر پور یوں ہے کہ وہ خود بھی موسیقی کے بڑے فن کار اور ماہر ہیں۔ وہ جس طرح تاروں کے بطن میں پوشیدہ مضطرب لے کو محسوس کرتے ہیں اسی طرح الفاظ کے سینے میں دھڑکتی ہوئی شعریت کو بھی محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ زبان شستہ و رفتہ اور سلیس ہے اور شعری حیثیت درخورِ اعتنا ہے۔ وہ کسی بات کو گھما کر کہنے کے عادی نہیں۔ وہی کہتے ہیں جو ان کی واردات قلب سے تعلق رکھے اور اسی انداز میں جو ایک محبت کرنے والا دل اور دماغ سوچتا ہے اور اس کی زبان کہہ سکتی ہے۔ ان کی زبان ایک محب کی زبان ہے اور ان کا انداز بیان ایک چوٹ کھائے ہوئے انسان کا انداز بیان ہے۔ وہ دیومالائی محبت نہ کرتے ہیں نہ ان کی شاعری دیومالائی ہے۔ ان کی شاعری ایک سچے انسان کا

اظہار جذبہ وخیال ہے۔ ایک سچے عاشق کی کہانی ہے جو اسی کی زبانی ہے۔ ایسا عاشق جو گوشت پوست کے انسان کی دنیا میں رہتا ہے۔ رنج وغم، سرد وگرم اور نیک وبد سے دوچار ہوتا ہے۔
مثلاً ان کا ایک قطعہ ہے۔

ایک مدت پہ ہوئی اُن سے ملاقات مگر
تشنگی رہ گئی اور بات نہ ہونے پائی

مل کے بھی دل میں ہمارے یہی ارماں رہا
اُن سے جی بھر کے ملاقات نہ ہونے پائی

ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

جس قدر کم تے گئے محروم دید
شوق کو وہ اور بھڑکاتے گئے

مطلع ہلکا پھلکا مگر کس قدر بامعنی اور لطیف ہے

جیسے جیسے وہ قریب آتے گئے
اہلِ دُنیا مجھ سے کتراتے گئے

کچھ مداوائے غم نہیں فیاضؔ
ایتو اک مرگِ ناگہاں کے سوا

مداوائے غم مرگِ ناگہاں کے سوا نہ ہونا بظاہر ایک معمولی بات ہے۔ لیکن اس میں جو یاس وکرب ہے اس کی کھٹک کسی دل ریش سے پوچھیے۔

مجھ کو رسوائے زمانہ کر کے
آپ انجان بنے بیٹھے ہیں

دو چھوٹے چھوٹے جملے ہیں لیکن ان کے معانی کی وسعت سے کسے انکار ہو سکتا ہے

اپنے حالِ تباہ کے صدقے
آشنا بھی تو آشنا نہ رہا

آشنا کی آشنائی کا فقدان محتاجِ بیان نہیں اور فقدان کا لوازمہ تباہ حالی ہے اور اس تباہ حالی پر قربان ہو جانے کا عزم آشنا کا شاکی بھی نہیں صرف اپنی تباہ حالی پر نالاں ہے۔

یہ کیا کیا جو نشیمن بنالیا میں نے
کہ برق پھر نظر آتی ہے بیقرار مجھے

اس شعر میں کتنی بھرپور شعریت ہے اور کتنا نامختتم تاثر ہے

عشق پر ناز بیجا نہیں ہو مجھے حسن فانی ہو اور عشق فانی نہیں
حسن والو تکو کس بات پر ناز ہے حسن اُنکا تو کچھ دن میں ڈھل جائیگا

بحرِ طویل میں چند ہی غزلیں فیاض صاحب کی ملیں وہ بھی زبان کی صفائی اور اندازِ بیان کے اعتبار سے بہت سلیس اور شگفتہ ہیں اور بہت خوب ہیں۔ عام طور پر ان کی زیادہ تر غزلیں چھوٹی

بحروں میں ہیں اور بڑی نرم اور مترنم ہیں اور گانے کی دُھن پر سو فی صدی پوری اُترتی .... ہیں۔ میں اکثر سوچنے لگ جاتا ہوں کہ اگر ان غزلوں کو کوئی فن کار صحیح طور پر گائے تو ان کا لطف کتنا دوبالا ہو جائے گا۔ گویا شراب دو آتشہ ہو کر اپنا خمار پھونک دے گی۔

ہے خوشی مجھ کو انکے آنے کی
ہاں مگر لطفِ انتظار گیا

انتظار کی بے تابی میں جو بیکراں لطف و لذت پنہاں ہے اور اس میں جو کیفیت جادو حال ہے وہ دیدار میں کہاں۔ اہل دل کو یہی انتظار دلدادۂ انتظار رکھتا ہے۔ کسی کی آمد جس طرح انتظار کے آبگینہ کو ٹھیس پہنچا کر اس کا لطف کرکرا دیتی ہے اور دلدادۂ انتظار کو محروم لذّت بنا دیتی ہے اُس کا حال کسی صاحب وجد و حال ہی سے پوچھئے۔

دے مرے عشق کو دعا اے دوست
جو ترے حُسن کو نکھار گیا

"حسنِ لیلی اعکسِ تمکینِ من است" کی بہترین تفسیر ہے۔

یہ راہ دیر و حرم ہے کیا ہے، مجھے تو کچھ ہوش ہی نہیں ہے
نہ جانے کس سمت چل پڑا ہوں غم زمانہ سے تنگ آکر

"غم زمانہ سے تنگ آکر" کے ٹکڑے نے دورِ نامساعد کی ایک ایسی تصویر نگاہوں کے سامنے پیش کردی ہے کہ اپنے جیسے بہت سے مجبور انسانوں کا ایک جم غفیر اپنے آگے آگے چلتا پھرتا نظر آتا ہے اور سب کے سامنے یہی ایک سوال ہے کہ:

منزل کہاں ہے؟

اب مثل اشک اُٹھ نہ سکوں گا زمین سے
اس طرح اس نظر سے گرایا گیا ہوں میں

"گرنے" میں صرف اپنا قصور پنہاں ہے۔ اور "گرایا گیا ہوں" میں اپنی شدید مجبوری و مظلومی پنہاں ہے۔ اور مثلِ اشک نگاہوں سے گر کر پھر نہ اُٹھ سکنے میں جو محزونیت و حرماں نصیبی ہے وہ بے حد اذیت ناک ہے۔

جنونِ عشق میں یہ کون سا مقام آیا
جہاں مجھے مرے سب غمگسار بھول گئے

جنونِ عشق کے مقامات تو بے حد و بے حساب ہیں مگر اس کا یہ مرحلہ جہاں سارے احباب

یک لخت نگاہیں چرا لیں یا بالکل بھول جائیں اور نظر انداز کر دیں وہ بڑا ہی جنون انگیز مرحلہ ہے۔

فیاض صاحب صرف حسن و عشق ہی کے بندے نہیں ہیں بلکہ زمانے کے سرد و گرم، درد و کرب اور سیاسی بحران و انتشار سے بھی روشناس ہیں۔ ان کی نگاہیں "حدیث گل و بلبل" سے ماسوا و ماورا کی دنیا سے بھی متعارف ہیں۔ اور ایک دنیادار ہونے کے ناتے وہ اس سے چشم پوشی بھی تو نہیں کر سکتے۔ سیاسیات و انقلابات پر بھی ان کی نظر رہتی ہے۔ الگ تھلگ بھی نہیں رہ سکتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مزدوروں کے خون پسینے کی زبردست ہانک لگا کر اپنی ترقی پسندی کا اعلان نہیں کرتے مگر اس ملال انگیز فضا سے دکھی ضرور ہوتے ہیں۔

چلا کرتی تھیں جو اس انقلاب دہر سے پہلے
اب ان دلکش ہواؤں کو میں اکثر یاد کرتا ہوں

اس شعر سے شاعر کی رجعت پسندی نہیں ظاہر ہوتی البتہ پرانی قدروں کی یاد اس کا دل ضرور برما رہی ہے اور وہ آج کے ہنگاموں میں "کل" کا سکون چاہتا ہوا نظر آتا ہے۔

زندہ ہوں تو اب دوست بھی ہیں مجھ سے گریزاں
مر جانے پہ دشمن بھی مجھے یاد کریں گے

ایک حقیقت پسندانہ شعر ہے اور غالباً ہم سب اس کا شکار ہیں۔

آپ سے ترکِ وفا ناممکن
اب زمانے سے عداوت ہی سہی

ایک بڑی بات کو مختصر الفاظ میں جامع طور پر کہنا اور اثر پزیری کو قائم رکھنا بڑا کمال ہے۔

یہ مشغلہ بھی غنیمت ہے ہم اسیروں کو
قفس میں بیٹھ کے نظارۂ بہار کریں

بادی النظر میں جو بہار ہے نہ جانے اس کی تہہ میں برق و شرر کی کیا کچھ ہولناکیاں اور تباہ کاریاں پوشیدہ ہیں جن کا ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے اور ان سے بچاؤ کی صورت خلوت گزینی یا اسیری ہے جسے ہم اپنی اس نام نہاد آزادی پر ترجیح دینے

میں حق بجانب ہوں گے۔

تلخیاں ایسی غمِ دوراں نے بخشیں ان دنوں
کردیا یادِ غمِ جاناں سے بھی غافل مجھے

سعدی شیرازیؒ کا شعر ہے ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

عشق ایسی بے نیازِ ہر دو عالم سچائی بھی قحط سالی میں دم توڑ دیتی ہے اس سے ایک اور حقیقت ہم پر منکشف ہوتی ہے کہ غمِ دوراں اور غمِ ناں کی تلخی بھی ان کو عشق اور غمِ جاناں سے غافل بنا دیتی ہے۔

فیاض صاحب کے یہاں محاکات بہت کافی ہیں اور ان کا سب سے بڑا وصف یہی ہے کہ ان کی کوئی بھی غزل "طولِ شبِ فرقت" یا درازیٔ زلف کی تصویر نہیں ہے۔ چھ سات زیادہ سے زیادہ آٹھ، دو تین غزلیں ذرا لمبی ہیں مگر اس لیے کھلتی نہیں ہیں کہ قوافی اور مفہوم کی تکرار نہیں ہے۔

ان کے پورے مجموعۂ کلام میں پھیلے ہوئے اشعار حقائق و معانی سے لبریز ہیں میں اپنے ذوق کے مطابق چند شعر پیش کرتا ہوں۔

کوئی اپنا نہیں زمانے میں
سب کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

اپنے بیمار کی خبر بھی نہ لی
دیکھ لی آپ کی مسیحائی

اور کیا چاہیے ثبوتِ وفا
مٹ گئے ہم تری خوشی کے لئے

جل رہے تھے امیدوں کے لاکھوں دیئے
ناامیدی نے سب روشنی چھین لی

تجھ سے اب ملنا مرا دشوار ہے
تو جہاں ہے میں وہاں سے دور ہوں

یہ آج جان لیا ہم نے ہجر کیا شئے ہے
سُنا ہی کرتے تھے قصّہ شبِ جدائی کا

گل تو پھر گل ہیں ہم تو خاروں سے
اپنا دامن کبھی بچا نہ سکے

دفعتہً مسکرا اُٹھیں کلیاں
جب چمن میں وہ گلعذار آیا

میں کس توقع پہ سہتا رہا ہوں ان کے ستم
یہ پوچھنے کی بھی فرصت اُنھیں کبھی نہ ملی

یاد رکھنا ہمارا شیوہ ہے
بھول جانا تمہاری عادت ہے

جو بجلیوں نے جلایا کبھی آشیاں اپنا
تو کیا ہم اور نشیمن بنا نہیں سکتے

چار تنکے تھے نشیمن میں مرے
بجلیوں کی زد میں وہ بھی آ گئے

قارئین کو "شعر و نغمات" میں اسی طرح کے ہلکے پھلکے حقائق سے مملو اور نیرنگ زمانہ کی عکاسی کرنے والے ان گنت اشعار ملیں گے۔ یقین ہے کہ پڑھنے والے مایوس اور حیران نہ ہوں گے اور فیاض صاحب کے متعلق ایک صحیح رائے قائم کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔

یہ مانا ابھی کم سنی ہے تمہاری غضب کی ہیں لیکن یہ بھولی ادائیں
لڑکپن میں یہ حال ہے جب تمہارا جوانی میں شاید قیامت کروگے

یہ جس غزل کا شعر ہے وہ پوری غزل بڑی مرصع اور خوبصورت ہے۔ اس کا ایک شعر ذہن میں محفوظ رہ گیا تھا جو ہدیۂ قارئین ہے۔ یہ غزل یوں خوبصورت ہے۔ کہ سیدھے سادے الفاظ کی غزل ہے جو جذبات یا واقعات نویسی پر مشتمل ہے۔
بات تو کوئی خاص نہیں مگر کہنے کا انداز مختص ہے۔ "شاید قیامت کروگے" جس طرح کچی نیند کے چند ٹکڑے آنکھ کے گوشوں میں پھنسے رہ جاتے ہیں اور کھٹکتے رہتے ہیں۔ یہ ٹکڑا بھی اسی طرح کچوکے لگانے والا ہے اور "شاید" میں اشتباہ کا کوئی پہلو نہیں بلکہ قیامت کی ہولناکیوں کے یقین کا دبے لفظوں میں اظہار ہے۔

جس کی سحر ممکن ہی نہیں ہو
ایسی کوئی شام نہیں ہے

فیاض صاحب جدید دور کے آدمی ہیں لیکن پرانی شریفانہ تہذیب اور اخلاق کا نمونہ ہیں۔ اور پرانی اقدار کی تصویر و تصور کی پرستار، اس لئے ان کا رنگِ کلام گو قدیم ہے اور شدت سے قافیہ، ردیف کے شیدائی اور اسیر، لیکن ان کی قدامت صرف فن کا لوازمہ ہے ورنہ ان کا پیکر اور ہیولیٰ جدت سے تہی داماں نہیں۔ پرانی رستی سے نئی بندش کا کام لینے میں ان کو ملکہ ہے اس طرح جدید و قدیم کا رنگ مخلوط ہو کر ایک خوش رنگ چیز بن جاتا ہے۔

ہمیں تو جب سے یہ ظلمت کدہ نصیب ہوا
کبھی ہم اپنی بھی پرچھائیاں نہ دیکھ سکے

لیکن یہ مقامِ قنوط و حنوط نہیں، صرف بر سبیل تذکرہ دورِ حاضر کا ایک خاکہ ہے۔

بس اک جھلک نے ہی بے ہوش کر دیا مجھ کو
ترے جمال کی رعنائیاں نہ دیکھ سکے

یہ فیاض صاحب کا شعر ہے۔

عرفی کہتا ہے ؎

نہ کوہی ز عطا بود عشق می داند
کہ ہر کرشمۂ ما تنگ بود خلعتِ طور

شاعر ایران یا توران کا ہو یا ہندوستان کا۔ بہت قابل ہو یا تھوڑا پڑھا لکھا۔ لیکن اگر صحیح وجدانِ شعری سے بہرہ اندوز ہے تو وہیں پہنچ کر وہ بولتا ہے جہاں بال جبریل تھک جاتے ہیں اور صرف نطق ہمایونی الہام ربّانی بن جاتا ہے۔

عرفی اور فیاض کا مفہوم ایک ہے۔ الفاظ جدا گانہ۔

"نہ دیکھ سکے" کہہ کر شاعر "قامتِ محبوب" اور "تجلائے حسن" کا گلہ نہیں کرتا بلکہ اپنی کوتاہ دامنی کا شکوہ کر رہا ہے۔ اسی کو "آدابِ حسن" کہا جاتا ہے۔

اے اہلِ چمن صحنِ چمن سے قفس اچھا
محفوظ تو ہو جائیں گے ہم برق و شرر سے

دُنیا بھر کے شکایتی الفاظ کے مقابلے میں یہ دو جملے اپنے اندر اتنی وسعت اور پہنائی رکھتے ہیں کہ ہم اپنی آزادی پر اس سے بہتر طنز کی اور کوئی توقع نہیں کر سکتے۔

لیجئے کسی اظہارِ خیال کے بغیر منھ کا مزہ بتدیل کرنے کے لئے کچھ مختلف رنگ روپ کے اور بھی اشعار سنتے چلئے۔

عجب کشمکش ہے سرِ بزم ان کو

(ق)

وہ مجھکو بلائیں کہ نظریں چرائیں

چھپاکر اپنے غم کو اُن کے آگے
میں اظہارِ مسرّت کر رہا ہوں

حیلہ تو چاہیئے کوئی جانے کے واسطے
سب کچھ سمجھ گیا تری انگڑائیوں سے میں

یہ بہاریں تو چار دن کی ہیں
کچھ نہ پاؤ گے پھر خزاں کے سوا

فنا و بقا کا ایک طویل مسئلہ تو حل ہو ہی جاتا ہے لیکن یہ پیغام درسِ عبرت حاصل کرنے کا بھی ایک ذریعہ ہے۔

آج کی دُنیا میں کتنے ہی بدنصیب ایسے ہیں جن کو بہار میسّر نہیں یا ہوائے بہار سازگار ہی نہیں اور کتنے ہی غیر مستحق آسودۂ بہار ہیں پھر بھی اس کی رنگ آمیزی کے لئے انسانی خون کے طلبگار ہیں۔

بچ کے طوفانوں سے کشتی جب کنارے پر لگی
دیر تک تکتا رہا ساحل کو میں ساحل مجھے

ساحل تو یوں تاک رہا تھا کہ بدبخت بچ کیسے گیا اور ساحل پر آگیا تو اس کا مصرف کیا ہوگا اور تاکنے والا اس لئے تاک رہا ہے کہ گرداب تو گرداب، ساحل بھی تو اسی جان لیوا گرداب کا ساحل ہے۔ میرا کیا ہوگا ؟

حسن میں جبکہ بوئے وفا ہی نہیں
خوب سی خوب تر ہوں تو میں کیا کروں

دیکھیئے یہ کتنا ذو معنی شعر ہے۔

شاعر کا کہنا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لاکھ حسین سہی ہوئے وفا نہیں تو پوچ کر کیا کروں اور یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ حسن میں ہوئے وفا ہی نہیں تو میں کیوں پوچھوں لیکن اس کو تو پوجنے کے لئے مجبور ہوں کہ وہ خوب سے خوب تر ہے جس کو نظر انداز ہی نہیں کیا جا سکتا۔

اور کیا چاہیے ثبوتِ وفا
مٹ گئے ہم تری خوشی کے لئے

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
دقت یہ ہے کہ ثبوتِ وفا کے طلبگار اپنے سلوک کا جائزہ کبھی نہیں لیتے کہ اس میں حسن ہے یا قبح، خیر ہے یا شر؟

بن کہے رازِ محبت ہے زمانے پہ عیاں
خامشی بھی مری گفتار ہوئی جاتی ہے

ذرا یہ رنگ دیکھئے!

آپ کی برہمی کو آگ لگے
یا مری بے بسی کو آگ لگے

مطلع کے دونوں ہی مصرعوں میں آگ لگنے کے اسباب و علل کو پیش کر کے توازن قائم رکھنا اور مختلف الخیال بنا دینا پھر اس چابکدستی کے ساتھ کہ بات بگڑنے نہ پائے۔ بہت مشکل تھا۔ مگر شاعر وقت میں آسانی کو ڈھونڈ نکالنے میں ماہر ہے۔ نرم گفتاری میں بھی تیز نگاہی کو بحال رکھنا بانکپن بھی ہے اور کٹھن بھی۔

میں جن کے تجسس میں کھو یا ہوا ہوں
کوئی ان سے ملنے کی صورت نہیں ہے

کرم کیا ستم بھی نہیں اب تو مجھ پر
مجھے پھر بھی ان سے شکایت نہیں ہے

یہ تسلیم ورضا کا وہ مقام ہے جہاں ہر کس وناکس کی پہنچ ممکن نہیں۔ اہل صفا ہی پہنچ سکتے ہیں اور محبوب کی خوشنودیٔ مزاج کو حاصلِ کائنات سمجھنے والا ہی یہ کہہ سکتا ہے۔

خدا نے چاند سی صورت تو دی تمہیں لیکن
سیاہ خانے کو میرے ہی روشنی نہ ملی

دیکھئے یہاں بھی شاعر کو محبوب کا گلہ شکوہ نہیں کیونکہ وہ اس بات کا عادی نہیں۔ اسے صرف اپنی تنگ دامانی ہی کی شکایت ہے۔ باایں ہمہ محبوب بھی عاشق کی رمزیات سے ناآشنا نہیں رہ سکتا۔

رازِ الفت نہ چھپ سکا ہم سے
ہم نے سب سے چھپا کے دیکھ لیا

کتنے سامان کر لئے پیدا
اتنی تھوڑی سی زندگی کے لئے

مری وفاؤں میں ہو گی ضرور کوئی کمی
مجھے ملال نہیں اُن کی کج ادائی کا

گزر چکا ہوں میں جب دور سے محبت میں
خدا وہ دَور کسی کو بھی اب نہ دکھلائے

کچھ گلہ ہو سکا نہ اُن کے حضور
ہم اُنھیں شرمسار کر نہ سکے

اُس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا

(ت)

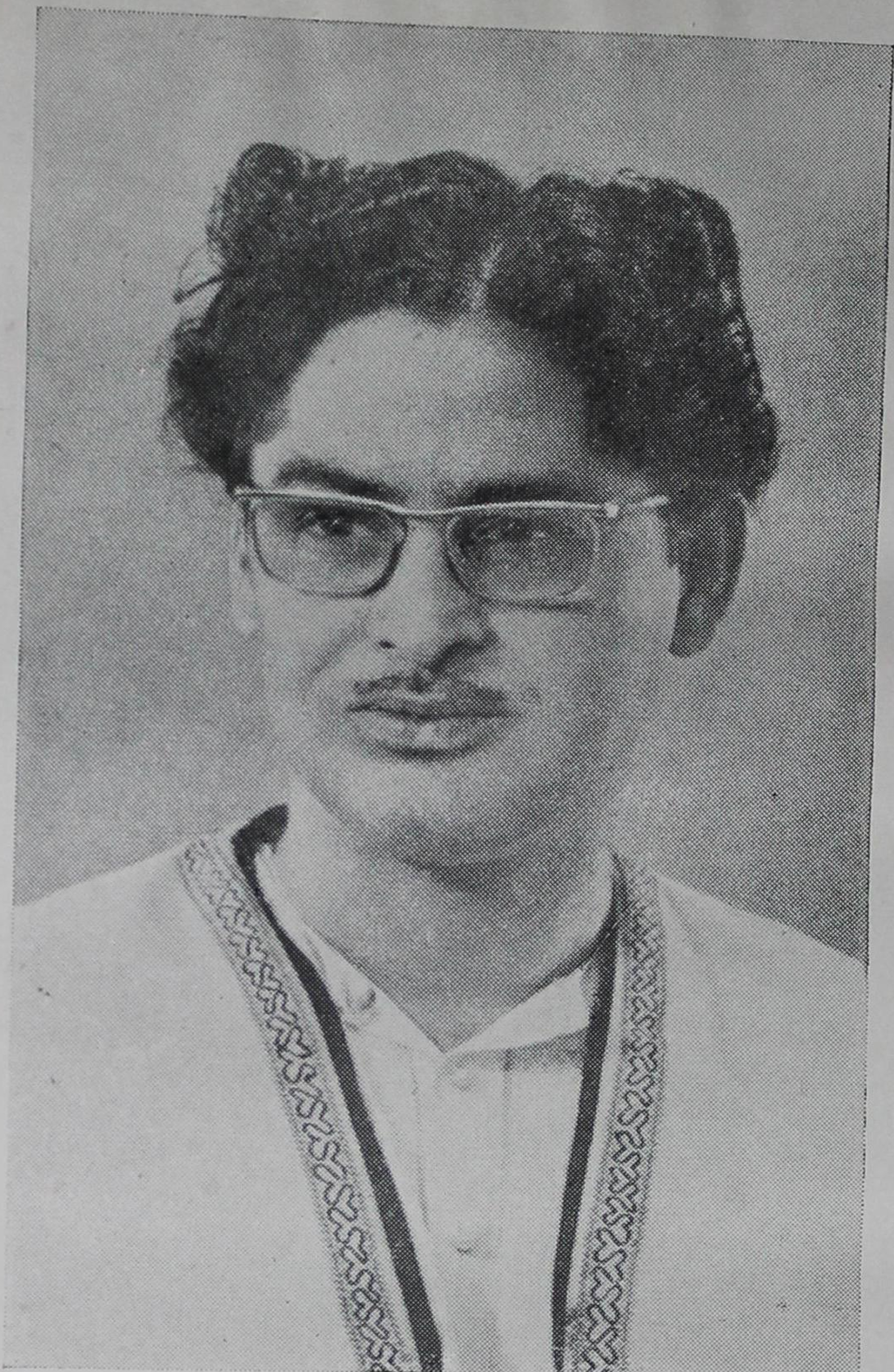
دل سے یہ غم جدا نہیں ہوگا

تہذیب و اخلاق کے اعتبار سے فیاض صاحب مجسم شرافت و سادگی ۔ خلوص و مزاج کے اعتبار سے پیکرِ ایثار اور مجسم باغ و بہار ہیں ۔ جھک کے ملنا اور شیریں انداز میں باتیں کرنا ۔ مل کر اپنا نقش چھوڑ جانا اور ملنے والے کی یاد کو اپنے دل میں باقی رکھنا ، تعلّی اور کبر و نخوت سے بہت دور ، منکسر المزاج اور جلد سے جلد گھل مل جانے والے آدمی ہیں ۔ مستقبل قریب میں ان کا رنگ اور بھی نکھریگا ۔ آج بھی بہت خوب اور خوب سے خوب تر ہیں ۔

عابد زاہدی

بمبئی ۳

۱۳ مارچ ۷۳ء



فیاؔض سے مِل کر ہوئے مسرور بہت ہم
اِس وضع کے کچھ لوگ ابھی باقی ہیں جہاں میں
(فیاؔض)

اس جانِ تخیّل کے نام

مُدّتوں محوِ جستجو رہ کر
تجھکو ڈھونڈا ہے تجھکو پایا ہے
ہو چکی ایک رُوح دو قالب
اب نہ میں اور تو پرایا ہے

دل مضطرب پہ کیا گزرتی ہے!

ایک آواز سوز میں ڈوبی
ساری محفل کو محو کرتی ہے
لیکن افسوس کون یہ جانے
دل مضطرب پہ کیا گزرتی ہے

مقدمہ

(از پیر سید ابوالکمال ضیاء الدین شمسی طہرانی۔ ایم۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ ریسرچ فیلو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

سرزمینِ راجستھان میں جے پور ایسا شہر ہے جسے روزِ اوّل سے ادب ریز، ادب خیز، ادب بیز اور ادب نواز کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ صرف ادب ہی نہیں بلکہ یہ شہر جملہ فنونِ لطیفہ کا ایک ایسا عظیم مرکز رہا ہے کہ جس کے کارنامے تاریخ ہند کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں۔ سنسکرت، ہندی، فارسی اور اُردو کے شعری و ادبی کارناموں کا مرکز، یہ عظیم شہر عالمگیر شہرت کا مالک ہے۔

غالباً ۱۹۲۹-۳۰ء میں اس شہر کو قدرت نے ایک ایسی ہستی کی ولادتِ باسعادت سے سرفراز کیا جس میں شعر و نغمہ و ادب و موسیقی کی تمام تر رعنائیاں سمٹ کر آ گئیں۔ گھر والوں نے اس مرکبِ شعر و موسیقی کا نام فیاض احمد خاں رکھ دیا۔

فیاض احمد خاں کے والدِ بزرگوار کا اسمِ گرامی استاد عبدالبشیر خاں تھا۔ جو گائیکی کے

اعتبار سے "کیرانہ گھرانا" سے متعلق تھے۔ اسی کیرانہ ضلع مظفر نگر سے استاد عبدالکریم خان اور استاد عبدالوحید خان جیسے موسیقار اُٹھے جو دُنیائے موسیقی پر چھا گئے۔

عہدِ طفلی میں فیاض احمد خاں موسیقی کی مشق و ریاضت میں مصروف تھے کہ ان پر مبدءِ فیاض سے شعر و سخن کا ملکۂ لطیف عطا ہونے کا راز نمایاں ہونے لگا۔ ابھی زندگی کی چودہ بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ سلمائے سخن کا حسن و جمال ان کے دل و نگاہ کو مسحور کرنے لگا۔

جے پور میں اُس وقت مرزا اسداللہ خان غالب کے شاگرد حکیم آگاہ دہلوی کے شاگرد مولوی حافظ محمد یوسف عزیز ٹونکی ثم جے پوری (الحال پاکستانی) کا نام ماہِ نیم ماہ اور مہرِ نیمروز کی طرح چمک رہا تھا۔ فیاض احمد خاں فیاض نے مولانا موصوف سے تلمذ اختیار کیا اور فنِ شعر کے جملہ اصول و قواعد سیکھنا شروع کر دیے۔ مولانا صاحب کے حلقۂ تلمذ سے ناظم سنبھلی اور عارف جے پوری جیسے فن کار مہر و ماہ بن کر اُبھرے اور سپہرِ شاعری پر چمکے۔

فیاض صاحب نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور استاد کی بے پایاں شفقت کی وجہ سے فنِ شاعری کے ہفت خواں کو بہت جلد طے کر لیا اور جلد ہی فارغ الاصلاح فرما دیا۔

۱۹۴۳ء سے فیاض صاحب نے بمبئی میں مستقل قیام کیا اور شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ فنِ موسیقی کے کمالات دنیا کے سامنے پیش کرنا شروع کیے۔ چنانچہ موسیقی میں اُن کے شاگرد ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ انھوں نے موسیقی کی ٹیوشنیں پڑھانے کے ساتھ ساتھ ریڈیو پروگرام بھی کیے۔ اُن کے ریکارڈ بھی بھرے گئے۔ انھوں نے موسیقی کی عظیم الشان کانفرنسوں میں بھی شرکت کی اور ایک دنیا سے خراجِ داد و تحسین وصول کیا۔ انھوں نے ۱۷-۱۸ سال تک فنِ موسیقی کے ایک اہم موضوع "اچھبت انگ بھاؤ" پر ریسرچ کا کام کیا اور جو بات کہ موسیقی دانوں کے نزدیک صرف ایک تخیلی حیثیت رکھتی تھی۔ اُسے آپ نے

ایک مکمل علمی و عملی شکل سے دنیائے موسیقی کے سامنے پیش کیا۔ ماہرانِ فن رہتی دنیا تک آپ کی تحقیقات سے مستفید ہوتے رہیں گے اور آپ کی یہ تحقیقات آئندہ کام کرنے والوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیں گی۔

آپ کے اخلاقِ حسنہ اور اوصافِ حمیدہ میں کچھ ایسی کشش اور مقناطیسیت ہے کہ جو ایک بار آپ سے ملاقات کر لیتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے آپ کا ہو جاتا ہے۔ آپ کی آواز کی طرح آپ کے اخلاق و عادات میں بھی ایک دل کش موسیقی پائی جاتی ہے۔ جس سے ہر فرد فطری طور پر متاثر ہوتا ہے۔

حضرت فیاض ذوقِ سلیم، مذاقِ صحیح۔ متانت طبع و سلامت مزاج۔ صحبت و ہمدردی، خودداری، اور مستقل مزاجی، جرأت و ہمت، بے تعصبی اور معاملہ کی صفائی۔ شعائرِ دین کی حرمت اور بزرگانِ دین سے عقیدت میں ایک منفرد شخصیت رکھتے ہیں۔ جو اس مشینی دور میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

آپ کی شاعری کا خالق وہی "دلِ گداختہ" ہے جس کے لئے غالب نے کہا ہے ؎

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

یہی دلِ گداختہ" ہے۔ جس کو چاہے۔ جمالیاتی حس کہو یا فطری ذوق۔ دردمند طبیعت سے تعبیر کرو یا حساس فطرت سے۔ بہر حال یہ ایک شاعر کے لئے ناگزیر ہے۔ اسی کے ساتھ ایک خاص سلیقہ بھی ضروری ہے۔ جس کے بغیر شاعر کے جذبات و افکار بے کار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ یہ دونوں وصف قدرت نے ان کو بڑی فیاضی سے عطا کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے تمام اصنافِ سخن میں غزل کو اپنی جولانگاہ

فکر بنایا۔ شعر کی تعریف میں کہا گیا ہے ؎

شعر کیا ہے ؟ حسن کی ہر ایک شے میں جستجو
اک نگارِ حسن سے پردے کے پیچھے گفتگو

میرے خیال میں یہ تعریف شعر پہ بالعموم اور غزل پر بالخصوص صادق آتی ہے۔ دوسری اصناف سخن کے مقابلے میں غزل کو داخلی شاعری قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ صحیح بھی ہے۔ کیونکہ وہ شاعر کی نفسیاتی کیفیت اور ذہنی واردات کی ترجمانی کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ غزل کی حیثیت آفاقی بھی ہے کیونکہ وہ ان حقائق کو بے نقاب کرتی ہے جو قیدِ زمان و مکان سے ماورا اور عالمگیر و لامحدود صداقت سے تعلق رکھتے ہیں۔ غرض کہ غزل داخلی بھی ہے آفاقی بھی۔ شخصی بھی ہے، عالمگیر بھی۔ قدرت نے جناب فیاض کو ایک حسن شناس طبیعت عطا کی ہے۔ جس کو زندگی کی بعض تلخیوں نے یاس و درد کا رنگ دے دیا ہے۔ یہی ذہنی و قلبی کیفیت ہے جو غزل کے مختلف النوع اشعار کی صورت میں آپ کی زبان سے ظاہر ہو رہی ہے۔ آپ نے دل کے زخموں کو گلہائے تبسم کے پردوں میں چھپانا چاہا۔ مگر آپ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس لئے کہ کلام شاعر قلب شاعر کا آئینہ ہوتا ہے

آپ کی زندگی محبت کی محرومیوں اور ناکامیوں سے گزری ہے۔ یہی سبب ہے کہ آپ کے کلام میں زندگی کی صداقت محسوس ہوتی ہے۔

ذیل میں آپ کے دیوان کے چند منتخب اشعار درج کر رہا ہوں۔ جنھیں پڑھ کر قارئین میرے خیال کی تائید کریں گے ؎

نہ بھرنا دم کسی کی دوستی کا
کہ دُنیا میں نہیں کوئی کسی کا

آئے تھے عشق میں ہستی جو مٹانے کے لئے
اک سبق چھوڑ گئے ہیں وہ زمانے کے لئے

جب تازہ ستم وہ کبھی ایجاد کریں گے
مجھ کو یہ یقیں ہے کہ مجھے یاد کریں گے

حسن کے جو دستور ہوئے
عشق کو سب منظور ہوئے

کروگے کسی پر بھی جب تم جفائیں
بہت یاد آئیں گی میری وفائیں

بچ کے طوفانوں سے کشتی جب کنارے پر لگی
دیر تک تکتا رہا ساحل کو میں ساحل مجھے

تلخیاں ایسی غم دوراں نے بخشیں ان دنوں
کردیا یادِ غم جاناں سے بھی غافل مجھے

کم نہیں میری زندگی کے لئے

چین مل جائے دو گھڑی کے لئے

اور کیا چاہیے ثبوتِ وفا
مِٹ گئے ہم تری خوشی کے لئے

موسمِ گُل اور یہ تنہائی
جانِ بہاراں تیری دُہائی
ہردم اُن کی یاد آتی ہے
جن کو ہماری یاد نہ آئی

حُسن جب خوگرِ جفا نہ رہا
پھر محبت میں کچھ مزا نہ رہا

اپنے حالِ تباہ کے صدقے
آشنا بھی تو آشنا نہ رہا

ستم کرنے والے کرم کیا کریں گے
وفا وہ کریں گے تو ہم کیا کریں گے

(خ)

کچھ اس طرح وہ گئے کر کے بے قرار مجھے
کہ چین مل نہ سکا ہائے ایک بار مجھے

تیری فرقت میں مجھے نیند کہاں آتی ہے
آنکھوں آنکھوں میں ہر اک رات گزر جاتی ہے

میں کس توقع پہ سہتا رہا ہوں اُن کے ستم
یہ پوچھنے کی بھی فرصت اُنھیں کبھی نہ ملی

یہ مشغلہ بھی غنیمت ہے ہم اسیروں کو
قفس میں بیٹھ کے نظارۂ بہار کریں

(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

مورخہ ۵ را پریل ۱۹۷۲ء

شعر و نغمے

فیاض
جے پوری

غزل

اُن کے جلوے سمیٹ لائی ہے
یہ نظر آج کام آئی ہے
اُن کی نظروں کا کیا قصور اس میں
ہم نے دانستہ چوٹ کھائی ہے
کھوئے کھوئے سے وہ بھی رہتے ہیں
بےخودی اپنی رنگ لائی ہے
اک اسیرِ قفس چمن والو
سُن رہا ہے بہار آئی ہے
ہائے جس پر مرا نشیمن تھا
برق نے شاخ وہ جلائی ہے

۲

یاس و غم، اشکِ حسرت و حرماں
عمر بھر کی یہی کمائی ہے

اب وہ آئے ہیں پرسشِ غم کو
جب ہمیشہ کو نیند آئی ہے

ہنستے ہنستے نکل پڑے آنسو
جانے کیا بات یاد آئی ہے

اُس پہ گر جاں نثار پروانے
شمع نے جس سے لو لگائی ہے

ہم نے فیّاض اپنے اشکوں سے
اپنے دل کی لگی بجھائی ہے

غزل

تیری فرقت میں مجھے نیند کہاں آتی ہے
آنکھوں آنکھوں میں ہر اک رات گزر جاتی ہے

اب تو اس طور سے ظالم تری یاد آتی ہے
کہ مجھے ہوش سے بیگانہ بنا جاتی ہے

میں تو ہر وقت تجھے یاد کیا کرتا ہوں
تجھکو بھولے سے کبھی یاد مری آتی ہے

تیرا ہر ظلم و ستم مجھکو گوارا ہے مگر
تیری غفلت سے مری جاں پہ بن آتی ہے

۴

اب یہ عالم ہے کہ بیدردزمانے کے ساتھ
اپنی حالت پہ مجھے خود بھی ہنسی آتی ہے
ختم ہوتی ہے شبِ غم کی کہانی فیاضؔ
شمع بجھتی ہے بس اب صبح ہوئی جاتی ہے

غزل

بتاؤ تو کب تک جفائیں سہونگا، کہانتک نہ پاسِ محبت کروگے
اگر میں بھی اپنے ارادے بدلدوں تو دُنیا سے میری شکایت کروگے

تمہاری محبت نے دے کر سہارا مرے جذبۂ عشق کی لاج رکھ لی
ابھی تک یہ دِل کو گماں تھا کہ شاید کبھی تم نہ مجھ سے محبّت کروگے

یہ مانا ابھی کمسنی ہی تمہاری غضب کی ہیں لیکن یہ بھولی ادائیں
لڑکپن میں یہ حال ہے جب تمہارا جواں ہو کے شاید قیامت کروگے

تمہیں نے کیا مجھکو رسوا جہاں میں کرم یہ تمہارا ہی مجھ پر ہوا ہے
مجھے تم سے امید یہ تو نہیں تھی کہ تم اس طرح میری شہرت کروگے

گزرتی ہے جس پر وہی جانتا ہے شبِ ہجر کیا اور غم کیا بلا ہے
تمہیں قدر کب ہوگی میری وفا کی کہ جب تم کسی سے محبّت کروگے

یہ کیا ہوگیا تم کو فیاضؔ آخر جو ترکِ محبّت کی ٹھانی ہے دل میں
سمجھ لو کہ چھوٹے بھی عشقِ بتاں سے تو پھر خواہشِ حور و جنّت کروگے

غزل

وہ میرے تصور پہ چھائے ہوئے ہیں
خیالوں کی دُنیا بسائے ہوئے ہیں

تری یاد ہی زندگی ہے ہماری
کلیجے سے اس کو لگائے ہوئے ہیں

فرشتے بھی گھبرائے جس بارِ غم سے
وہی بارِ غم ہم اُٹھائے ہوئے ہیں

تمہاری قسم ان نگاہوں میں ابتک
تمہارے ہی جلوے سمائے ہوئے ہیں

جلا تھا جہاں آشیانہ ہمارا
وہیں پھر نشیمن بنائے ہوئے ہیں
خدا کے لئے آ بھی جا آنے والے
کہ ہم آس کب سے لگائے ہوئے ہیں
کسی پر نہ فیّاض کرنا بھروسہ
کہ ہم بھی یہی چوٹ کھائے ہوئے ہیں

غزل

پاؤں راہِ عشق میں تھرّا گئے
لاکھ سنبھلے پھر بھی ٹھوکر کھا گئے

بیٹھے بیٹھے جانے کیا یاد آ گیا
یک بیک آنکھوں میں آنسو آ گئے

ہم نہ پیتے بھول کر جامِ شراب
اُن کی نظروں کا اشارہ پا گئے

تابِ نظّارہ نہ ہم سے ہو سکی
وہ تو چلمن سے جھلک دکھلا گئے

چار تنکے تھے نشیمن میں مرے
بجلیوں کی زد میں وہ بھی آ گئے

تھا گوارا ہر ستم تیرا کبھی
اب کرم سے بھی ترے گھبرا گئے

یاد جب بھی آ گئے فیاض وہ
دل پہ جیسے غم کے بادل چھا گئے

غزل

ترا عشق دل میں بسایا نہ ہوتا
تو دُنیا کو دشمن بنایا نہ ہوتا

مجھے اپنے دل سے بُھلا دینے والے
تصوّر میں بھی میرے آیا نہ ہوتا

مآلِ محبّت سے واقف جو ہوتے
فریبِ نظر ہم نے کھایا نہ ہوتا

نہ رکھنا تھا مطلب تو پھر او ستمگر
وفا کو مری آزمایا نہ ہوتا

بتاؤ تو پھر برق کس کو جلاتی
جو میں نے نشیمن بنایا نہ ہوتا
کچھ اس کے علاوہ سزا اور بھی تھی
مجھے یوں نظر سے گرایا نہ ہوتا
نہ ہوتا بچھڑنے کا فیاضؔ کچھ غم
جو یوں رابطہ اُن سے بڑھایا نہ ہوتا

غزل

نہ بھر نا دم کسی کی دوستی کا
کہ دُنیا میں نہیں کوئی کسی کا

گیا جو دَور تھا عیش و خوشی کا
زمانہ کب رہا یکساں کسی کا

نہ سوچا تھا کبھی بھُولے سے میں نے
کہ یہ انجام ہو گا دل لگی کا

وہ میرے نام سے بیزار ہیں اب
مجھے دعوےٰ تھا جن کی دوستی کا

نہ ہوتا اِس طرح برباد لیکن
مجھے تو پاس تھا اُن کی خوشی کا

ملا ظلمت کدہ قسمت سے ایسا
کہ سایہ تک نہیں ہے روشنی کا
ہوا ہے ہجر میں جو حال میرا
نہ ایسا حال ہو یارب کسی کا
نہ جانے کب کوئی جھونکا بجھا دے
بھروسہ کیا ہے شمعِ زندگی کا
کروں ترکِ محبّت میں جو ناصح
تو پھر کیا لطف ہے اس زندگی کا
رہے خاموش اُن کا ظلم سہہ کر
بھلا ایسا جگر ہوگا کسی کا
زمیں سے چاند پر پہنچا ہے ظالم
یہ کیا کم حوصلہ ہے آدمی کا
مجھے رہ رہ کے اے فیاضؔ اکثر
خیال آتا ہے اُن کی بے رُخی کا

غزل

خطا جب برق کا ہوگا نشانہ
تو خود ہی پھونک دوں گا آشیانہ

مری روداد سُن کر ہنسنے والے
حقیقت کو سمجھتا ہے فسانہ

نہ آئیں راس گلشن کی بہاریں
جلا دے برق میرا آشیانہ

ستالے خوب تو جی بھر کے ظالم
کبھی آئے گا اپنا بھی زمانہ

مزے جی بھر کے لے لو زندگی کے
نہ آئے گا پلٹ کر یہ زمانہ
وہ دم بھر کے لئے فیّاض آئے
مگر پھر چل دئے کر کے بہانہ

غزل

تمہاری بزم سے ہم اُٹھ کے جا نہیں سکتے
چلے گئے تو سمجھ لو کہ آ نہیں سکتے

یہ ڈر رہے رازِ محبّت عیاں نہ ہو جائے
ہیں اشک آنکھوں میں لیکن بہا نہیں سکتے

کچھ ایسا داغِ الم دے گیا ہے کوئی ہمیں
مٹانا چاہیں بھی تو ہم مِٹا نہیں سکتے

جو بجلیوں نے جلایا بھی آشیاں اپنا
تو کیا ہم اور نشیمن بنا نہیں سکتے

اب اُن کی یاد ہے فیاضؔ اور بس ہم ہیں
وہ بھول جائیں مگر ہم بھلا نہیں سکتے

غزل

وہ شرمائے نظریں ملانے سے پہلے
محبّت جتا دی چھپانے سے پہلے
مرے جذبِ دل کی کشش تم نے دیکھی
کہ خود آ گئے ہو بُلانے سے پہلے
بُجھانے چلے اب تمہیں آگ دل کی
تمہیں نے لگائی بجھانے سے پہلے
گھٹاؤں میں چھپ چھپ کے اب قاروئی
نہ روئی نشیمن جلانے سے پہلے

تمہیں پھر مرے پاس آنا پڑے گا
ذرا سوچ لو دُور جانے سے پہلے
ڈبویا ہے طوفاں نے فیاضؔ اپنا
سفینہ کنارے پہ آنے سے پہلے

غزل

یہ ترے حسن کی جو شہرت ہے
سب مرے عشق کی بدولت ہے

اُن سے الفت تو درحقیقت ہے
اب یہ کہنے کی کس کو جرأت ہے

شادماں کوئی اور کوئی ناشاد
دیکھئے اپنی اپنی قسمت ہے

یاد رکھنا ہمارا شیوہ ہے
بھول جانا تمہاری عادت ہے

کیا بتاؤں کہ حال کیسا ہے
تم نے پوچھا یہی غنیمت ہے
صبر سے کام لو ذرا فیاضؔ
ہر مصیبت کے بعد راحت ہے

غزل

بھول کر بھی نہ مرے لب پہ شکایت ہوگی
جانتا ہوں کہ انھیں سن کے ندامت ہوگی

میں نے سمجھا ہے تجھے زیست کا حاصل اے دوست
تو نے گر پھیر لیں نظریں تو قیامت ہوگی

رنگ لائے گا جنوں جذبِ محبّت کی قسم
مری رُسوائی ہی اک دن تری شہرت ہوگی

یہ حقیقت ہے مری رُوح کی تسکین ہے تو
تیرا آغوش ہی میرے لئے جنّت ہوگی

آج فیاض زمانے کو بھلا بیٹھا ہے
تجھ سے اے جانِ وفا خاص ہی نسبت ہوگی

غزل

وہ مجھ پہ ترس کھائیں یہ قسمت ہی نہیں ہے
میں شکوہ کروں یہ مری فطرت ہی نہیں ہے

انجان بنے بیٹھے ہیں وہ بزم میں ایسے
جیسے کہ کسی سے اُنھیں نسبت ہی نہیں ہے

نکلا بھی قفس سے تو نہ پہنچوں گا چمن تک
مجبور ہوں پرواز کی طاقت ہی نہیں ہے

اے کاش ترا قرب جو ہو جائے میسّر
پھر مجھکو کسی شے کی ضرورت ہی نہیں ہے

فیّاض فقط اپنے مقدّر سے گلہ ہے
اُن سے تو مجھے کوئی شکایت ہی نہیں ہے

غزل

ہم ان کی نظر سے گر رہے جا رہے ہیں
یہ جرمِ وفا کی سزا پا رہے ہیں

رہا جن کا کل تک کرم مجھ پہ اے دل
وہی آج مجھ پر ستم ڈھا رہے ہیں

ذرا کوئی دیکھے یہ غنچوں کا عالم
کہ کھِلنے سے پہلے ہی مرجھا رہے ہیں

مجھے چھوڑ کر گو بظاہر تو خوش ہیں
مگر دل ہی دل میں وہ پچھتا رہے ہیں

میں جتنا اُنھیں بھولنا چاہتا ہوں
وہ اُتنا ہی کیوں مجھکو یاد آ رہے ہیں

حوادث ہی فیاض ہیں میرے رہبر
مجھے میری منزل پہ پہنچا رہے ہیں

غزل

ہمارے دم سے ہی مہر و وفا ہے
ہمارے بعد پھر یاں کیا دھرا ہے

تری نظروں میں شوخی ہے حیا ہے
مگر کچھ اور بھی ہے جانے کیا ہے

نہ جانے کس طرف اب لے چلا ہے
یہ میرے دل کو آخر کیا ہوا ہے

تو روحِ شاعری جانِ وفا ہے
یہ دل صدقے ہے تجھ پر جان فدا ہے

تصور میں تمہیں رہتے ہو ہر دم
بتاؤ تو مجھے کیا ہو گیا ہے

جدا کس طرح تم سے رہ سکوں گا
یہی ہر دم مرا دل سوچتا ہے
نہ آنکھوں میں بجز تیرے ہے کوئی
نہ اس دل میں کوئی تیرے سوا ہے
مجھے طوفاں کا ڈر فیاضؔ کیوں ہو
مری کشتی کا حافظ جب خدا ہے

غزل

یہ تری مجھ پہ عنایت ہی سہی
تیرا ہر غم مری قسمت ہی سہی

اک تبسم ہی ترا کافی ہے
میرے اشکوں کی یہ قیمت ہی سہی

آپ سے ترکِ وفا ناممکن
اب زمانے سے عداوت ہی سہی

میرے بس میں تو نہیں ہے اے دوست
خواہ وہ ترکِ محبت ہی سہی

آپ غیروں سے ہی رکھئے نسبت
اور مجھے آپ سے الفت ہی سہی
وہ تو فنیاض یقیں کر نہ سکے
گو مرا عشق حقیقت ہی سہی

غزل

اہلِ محفل کی قیاس آرائیاں
بن گئیں آخر مری رسوائیاں

اُس طرف وہ اور اُن کی بزمِ ناز
اِس طرف میں اور مری تنہائیاں

دل پہ جیسے نقش بن کر رہ گئیں
اُن کی وہ مجھ پر کرم فرمائیاں

اب میں غیروں کی شکایت کیا کروں
مجھ سے بدظن ہیں مری پرچھائیاں

لے گئیں فیاض دل کو چھین کر
ہائے وہ اُس شوخ کی انگڑائیاں

غزل

تمہیں کو ڈھونڈتا پھرتا تھا حسن والوں میں
تمہیں تو ہو جو بسے ہو مرے خیالوں میں

یہ میں نے آئینہ دکھلا کے عرض کی ان سے
تمہارا عکس ہے یا تم ہو بے مثالوں میں

بس اک نظر نے ہی ساقی کی کر دیا مدہوش
عجیب کیف ہے مستی ہے ان پیالوں میں

زباں کھل نہ سکی، کچھ جواب بن نہ سکا
تھی کچھ عجیب سی لذت ترے سوالوں میں

شبِ فراق میں جب اُن کی یاد آتی ہے
تو ایک ٹیس سی اُٹھتی ہے دل کے چھالوں میں
سُنا ہے ہو کے وہ مجبور آ رہے ہیں آج
اثر ہوا تو ہے فیاؔض میرے نالوں میں

غزل

مری مایوس نظروں کو ترا دیدار ہو جائے
تو یہ سوئی ہوئی تقدیر پھر بیدار ہو جائے

قیامت کی کشش ہے تجھ میں جو بھی اک نظر دیکھے
وہ تجھ پر جان دینے کے لئے تیار ہو جائے

ترا غم ہے متاعِ زیست یہ میں بھی سمجھتا ہوں
مگر وہ کیا کرے جو زیست سے بیزار ہو جائے

تمہارے در پہ میں کب سے لگائے آس بیٹھا ہوں
ادھر بھی اک نگاہِ لطف اے سرکار ہو جائے

اڑاتے ہو ہنسی فیاضؔ تم میری محبت کی
مری صورت تمہیں بھی عشق کا آزار ہو جائے

غزل

عشق کی جو ادا سمجھتے ہیں
وہ سزا کو جزا سمجھتے ہیں

میں ہوں محوِ تصورِ جاناں
لوگ کھویا ہوا سمجھتے ہیں

جو سمجھ میں کبھی نہیں آتا
اس کو ہم بارہا سمجھتے ہیں

یہ تبسم یہ نیچی نیچی نظر
اس کا ہم مدعا سمجھتے ہیں

میں تو کرتا ہوں جان اُن پہ فدا
اور وہ کیا جانے کیا سمجھتے ہیں

اُن سے رکھوں میں کیا امیدِ کرم
جو ستم کو روا سمجھتے ہیں

جو بھی ان کے بھلے کی کہتا ہے
وہ اُسی کو بُرا سمجھتے ہیں

تم ہمیں غیر جانتے ہو مگر
ہم تو جانِ وفا سمجھتے ہیں

جانے کیوں دو دلوں کا مل جانا
اہلِ دُنیا بُرا سمجھتے ہیں

اُن سے کیا عرضِ حال ہو فیاضؔ
جو مرا مدّعا سمجھتے ہیں

غزل

مجھے دیکھا کچھ اس نے اس ادا سے
نگاہیں جھک گئیں میری حیا سے
پھریں گے اب نہ ہم اپنی وفا سے
جو ہونا ہے وہ ہو جائے بلا سے
قسم ہے اب تمہیں میری وفا کی
خدا را ہاتھ مت کھینچو جفا سے
نہ جانے کیا خطا مجھ سے ہوئی ہے
نظر آتے ہیں اب وہ کچھ خفا سے

مجھے قسمت سے جب وہ مل گئے ہیں
توپھراب مانگنا کیا ہے خدا سے
اُدھر وہ ہیں جدا ہو کر پریشاں
اِدھر ہم بھی ہیں کچھ بے آسرا سے
ہمیں فیاض قسمت سے گلہ ہے
شکایت کیا کریں اُس بے وفا سے

غزل

نہ دوستی نہ تری دشمنی سے نفرت ہے
جو ہے تو مجھکو تری بےرُخی سے نفرت ہے

ترے شریک تو تھی زندگی عزیز مگر
جو تو نہیں تو مجھے زندگی سے نفرت ہے

میں پی رہا ہوں ہر اک غم کو بھُولنے کیلئے
تمہیں فضول مری مے کشی سے نفرت ہے

تمہیں عزیز سمجھتا ہے جو زمانے سے
عجیب بات ہے تم کو اُسی سے نفرت ہے

جو کچھ کہوں تو اُنھیں ناگوار ہوتا ہے
جو چُپ رہوں تو مری خامشی سے نفرت ہے
جب اُس نے بزم میں دیکھا نہ اک نظر فیاض
تو میں یہ سمجھا کہ شاید مجھی سے نفرت ہے

غزل

وہ جفاؤں سے ہاتھ اُٹھا نہ سکے
ہم وفاؤں سے باز آ نہ سکے

ہائے مجبوریاں محبت کی
اُن سے نظریں بھی ہم ملا نہ سکے

گل تو پھر گل ہیں ہم تو خاروں سے
اپنا دامن کبھی بچا نہ سکے

عشق میں صبر و ضبط ہو ایسا
کبھی شکوہ زباں پہ آ نہ سکے

۱۴۱

قصۂ غم اُنھیں سُنانا تھا
سامنا جب ہوا سُنا نہ سکے
یہ بھی جینے میں کوئی جینا ہے
کبھی جی بھر کے مُسکرا نہ سکے
ایک وہ ہیں ہمیں بھُلا بیٹھے
ایک ہم ہیں اُنھیں بھُلا نہ سکے
امتحانِ وفا وہ کیا دے گا
ضبطِ غم کی جو تاب لا نہ سکے
کیا مِلائیں گے دل سے دل فیاضؔ
جب نظر سے نظر مِلا نہ سکے

غزل

اِن سنگدلوں سے اُلفت کا اظہار کئے سے کیا ہوگا
اک بار کیا تو کیا پایا سو بار کئے سے کیا ہوگا

ان کو تو یقیں اُلفت کا مری اب تک نہ ہوا ہوگا نہ کبھی
پھر اپنے دل کو پابندِ آزار کئے سے کیا ہوگا

یہ دُنیا والے کہتے ہیں میں اُن کی تمنا کرتا ہوں
مانا کہ غلط ہے لیکن اب انکار کئے سے کیا ہوگا

ناکامِ محبّت پر اب تو تم اپنی نوازش رہنے دو
یہ لطف و عنایت چھوڑو بھی بیکار کئے سے کیا ہوگا

فیاضؔ مجھے مت سمجھاؤ میں سب کچھ سمجھے بیٹھا ہوں
پہلے سے جو ہو بیدار اُسے بیدار کئے سے کیا ہوگا

غزل

مجھے انجمن آپ کی مل گئی ہے
یہ سمجھو نئی زندگی مل گئی ہے

تری یاد ہے مشعلِ راہ مجھکو
اندھیرا تھا اب روشنی مل گئی ہے

بڑے کام کے تھے یہ شبنم کے آنسو
ہر اک پھول کو تازگی مل گئی ہے

مرا نام ہے آج اُن کے لبوں پر
مجھے قیمتِ دوستی مل گئی ہے

وہ کیا مل گئے آج فیاضؔ جیسے
زمانے کی مجھکو خوشی مل گئی ہے

غزل

جو مجھ تک بھی ساقی کا اک جام آتا
تو پھر یوں نہ محفل سے ناکام آتا
جو اُن کی توجہ نہ ہوتی تو اے دل
ترا جذبۂ شوق کس کام آتا
انھیں قدر ہوتی جو میری وفا کی
تو ان کے لبوں پر مرا نام آتا
چمکتی نہ میرا نشیمن جلا کر
تو اے برق تجھ پر نہ الزام آتا

نہ کرتے مداوائے غم آتو جاتے
کہ بیمار کو کچھ تو آرام آتا
اِن آنکھوں کو فیاضؔ حسرت یہی ہے
کہ اک بار پھر وہ لبِ بام آتا

غزل

مٹا میں جن کے لئے ان کی دوستی نہ ملی
ہے مجھکو یاد جہاں تک مجھے خوشی نہ ملی

خدا نے چاند سی صورت تو دی ہمیں لیکن
سیاہ خانے کو میرے ہی روشنی نہ ملی

اک ایسا گلُ بھی ہماری نظر سے گزُرا ہے
چمن میں رہ کے بھی جس گلُ کو تازگی نہ ملی

میں کس توقع پہ سہتا رہا ہوں اُن کے ستم
یہ پُوچھنے کی بھی فرصت اُنھیں کبھی نہ ملی

برائے نام ہے یہ زندگی تو اے فیاض
جسے میں ڈھونڈ رہا ہوں وہ زندگی نہ ملی

غزل

آئے تھے عشق میں ہستی جو مٹانے کے لئے
اک سبق چھوڑ گئے ہیں وہ زمانے کے لئے

کارواں والے پہنچ بھی گئے منزل کے قریب
رہ گئے ہم ہی فقط ٹھوکریں کھانے کے لئے

دیکھ پچھتائے گا تو مجھکو مٹا کر ظالم
کون آئے گا ترے ناز اُٹھانے کے لئے

جانے کیوں اُٹھ کے چلے آئے تھے ہم محفل سے
اب ترستے ہیں تری بزم میں آنے کے لئے

مجھ سے پھر آج وہ رُوٹھے ہیں مگر اے فیاض
اب نہ جاؤں کبھی اُن کو منانے کے لئے

غزل

مانوس ایسا ہو گیا تنہائیوں سے میں
اب بھاگتا ہوں اپنی ہی پرچھائیوں سے میں

دُنیا نے خیر مجھکو تو بدنام کر دیا
ڈرتا ہوں اب تو آپکی رسوائیوں سے میں

حیلہ تو چاہیئے کوئی جانے کے واسطے
سب کچھ سمجھ گیا تری انگڑائیوں سے میں

اس کا ملال ہے کہ کہیں کا نہیں رہا
گر کر ترے خیال کی بالائیوں سے میں

فیاض اس لئے نہیں اُٹھتے مرے قدم
واقف نہیں ہوں عشق کی گہرائیوں سے میں

غزل

کسی سے بھی ان کو محبّت نہیں ہے
ہماری تو کچھ بھی حقیقت نہیں ہے
غلط ہے کہ مجھکو محبت نہیں ہے
مگر اُن سے کہنے کی جراُت نہیں ہے
میں جن کے تجسس میں کھویا ہوا ہوں
کوئی ان سے ملنے کی صورت نہیں ہے
سبب اس کا اے کاش تو ہی بتا دے
کہ مجھ پر تری کیوں عنایت نہیں ہے

کرم کیا ستم بھی نہیں اب تو مجھ پر
مجھے پھر بھی اُن سے شکایت نہیں ہے
کروں گا نہ فیاضؔ ترکِ وفا میں
انھیں لاکھ پاسِ محبت نہیں ہے

غزل

رہا ہوئے بھی قفس سے تو آشیاں نہ ملا
ہمیں تو شاخِ چمن کا بھی کچھ نشاں نہ ملا

مری وفاؤں نے مجبور کر دیا ایسا
کہ کوئی عذر اُنھیں بعدِ امتحاں نہ ملا

ہوا نہ سامنا قاصد سے پھر کبھی میرا
مری طرف سے انھیں کر کے بدگماں نہ ملا

ذرا گرفت سے چھوٹا تو پھر کہاں پہنچا
کہ ڈھونڈتی ہی رہی تیر کو کماں نہ ملا

فریب ایسے دیئے ہیں ترے تصور نے
میں ڈھونڈنے وہیں پہنچا کہ تو جہاں نہ ملا
ہزاروں لے گئے فیاضؔ دل میں یہ ارماں
کبھی کسی کو سکوں زیرِ آسماں نہ ملا

غزل

تم نے تو مجھ کو غم کے سوا اور کیا دیا
لیکن تمہارے غم نے بھی کیا کیا مزا دیا

کیسا ستم ہے کل جسے آنکھوں میں دی جگہ
اب آج اسی کو تم نے نظر سے گرا دیا

یہ کوہ کن کی ضد تھی کہ اک بت کے واسطے
لاکھوں بتوں کے خون کا دریا بہا دیا

تھے اور بھی تو آشیاں گلشن میں پھر یہ کیا
اے برق کیوں مرا ہی نشیمن جلا دیا

قسمت میں جو بھی لکھا تھا آخر وہی ہوا
اب کس کو دوش دوں مجھے کس نے مٹا دیا

اس بیوفا کی اب میں شکایت بھی کیا کروں
یاد اُس نے کب کیا تھا جو سمجھوں بھلا دیا

دامن چھڑا کے جاتے ہیں فیاضؔ آج وہ
یہ دن بھی اب نصیب نے مجھ کو دکھا دیا

غزل

جوش پر موسمِ بہار آیا
ہر شگوفے پہ اک نکھار آیا

تھی اُمیدِ قرارِ دل افسوس
اُن کی محفل سے بے قرار آیا

جب کہ ٹھکرا دیا زمانے نے
تب مجھے زندگی پہ پیار آیا

وائے قسمت مری وفاؤں کا
ان کو اب تک نہ اعتبار آیا

دفعتاً مُسکرا اُٹھیں کلیاں
جب چمن میں وہ گلعذار آیا

ایک لمحہ ترے بغیر کبھی
کیسے کہہ دوں مجھے قرار آیا
مجھ سے پھر کس لئے شکایت ہے
خود ترے دل میں جب غبار آیا
جو گیا اس جہاں سے اے فیاض
لوٹ کر پھر نہ ایک بار آیا

غزل

جب ترا انتظار ہوتا ہے
ایک لمحہ بھی بار ہوتا ہے

دُور رہوتے ہو جب نگاہوں سے
دل بہت بے قرار ہوتا ہے

چند اشکوں کی نذر کرتا ہوں
دل میں جتنا غبار ہوتا ہے

لطف بھی ایک بار ہو جائے
ظلم تو بار بار ہوتا ہے

ہیں مقدّر رہیں گردشیں کیا کیا
اس کا کس کو شمار ہوتا ہے
جھوٹے وعدوں پہ اُن کے اے فیاضؔ
کیوں تمہیں اعتبار ہوتا ہے

غزل

آپ کی بر ہمی کو آگ لگے
یا مری بے بسی کو آگ لگے

مجھ سے دامن چھڑا کے جاتے ہیں
ان کی اس بے رُخی کو آگ لگے

زندگی اور وہ بھی تیرے بغیر
پھر تو اس زندگی کو آگ لگے

اُن کے آگے زباں کھُلی نہ کبھی
میری اس خامشی کو آگ لگے

دلِ بُلبل کا خون کر ڈالا
پھُول کی پنکھڑی کو آگ لگے
مجھکو فیاض کر دیا برباد
اس غمِ عاشقی کو آگ لگے

غزل

آپ چاہیں تو کیا نہیں ہو گا
کیا کسی کا بھلا نہیں ہو گا

اُس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
دل سے یہ غم جُدا نہیں ہو گا

ٹُوٹ ہی جائے جب کسی کی آس
کون بے آسرا نہیں ہو گا

آپ کی جس پہ ہو نگاہِ کرم
پھر وہ بے آسرا نہیں ہو گا

عشق میں قیس تھا کہ بس میں ہوں
اور اب تیسرا نہیں ہوگا
لوگ فیاض کو بُرا سمجھیں
آدمی وہ بُرا نہیں ہوگا

غزل

لاکھ وہ جلوہ گر ہو تو میں کیا کروں
جب نہ تابِ نظر ہو تو میں کیا کروں

خود بخود آنکھ تر ہو تو میں کیا کروں
دل ہی نا معتبر ہو تو میں کیا کروں

جا رہا تھا جنوں میں نہ جانے کدھر
راہ میں تیرا در ہو تو میں کیا کروں

چھوڑ کر تم بھی مجھکو چلے جاؤ گے
اے ستارو سحر ہو تو میں کیا کروں

غیر کیوں رشک سے دیکھتے ہیں مجھے
ان کی مجھ پر نظر ہو تو میں کیا کروں

ناصحا! تیرا کہنا بجا ہے مگر
جب نہ دل پر اثر ہو تو میں کیا کروں
حُسن میں جب کہ بُوئے وفا ہی نہیں
خوب سے خوب تر ہو تو میں کیا کروں
میں نے ہر طرح فیاض کوشش تو کی
کم نہ دردِ جگر ہو تو میں کیا کروں

غزل

جذبِ دل میرا کشش کچھ ایسی دکھلائے کہ بس
ہو کے وہ مجبور مجھ تک اس طرح آئے کہ بس

صبحدم دیکھا تھا جن کو زینتِ رنگِ چمن
وہ ہی غنچے شام تک کچھ ایسے کملائے کہ بس

ہائے وہ لمحے خوشی کے جو گزارے تھے کبھی
آج وہ لمحے مجھے کچھ ایسے یاد آئے کہ بس

حسن کی معصومیت کا کیا ٹھکانہ ہے بھلا
مجھ پہ اس معصومیت نے وہ ستم ڈھائے کہ بس

کیا ڈراتی ہے ہمیں اے موجِ طوفاں بار بار

ہم تو ایسے ایسے طوفانوں سے ٹکرائے کہ بس

کاش ساقی اک نظر بھر کر مجھے تو دیکھ لے

مجھ پہ وہ نشّہ ترے سر کی قسم چھائے کہ بس

اب مرے دل میں کوئی حسرت کوئی ارماں نہیں

عشق نے فیاضؔ وہ وہ رنگ دکھلائے کہ بس

غزل

آنکھ بھی اشک بار کر نہ سکے
صبر بھی اختیار کر نہ سکے

کچھ گلہ ہو سکا نہ اُن کے حضور
ہم انھیں شرمسار کر نہ سکے

اب مداوائے غم کرے گا کون
جب مرے غم گسار کر نہ سکے

تھیں مقدّر میں گردشیں اتنی
جن کا ہم کچھ شمار کر نہ سکے

ہم چمن میں رہے مگر پھر بھی
اہتمامِ بہار کر نہ سکے
زندگی ہائے بے وفا نکلی
ہم ترا انتظار کر نہ سکے
آپ فیاض کی محبّت کا
آج تک اعتبار کر نہ سکے

غزل

جنونِ عشق کے صدقے وہ دن بھی آجائے
کہ حُسن میری وفاؤں پہ ناز فرمائے

گزر چکا ہوں میں جس دور سے محبت میں
خدا وہ دَور کسی کو بھی اب نہ دکھلائے

ہوئے ہیں لطف و کرم بھی کسی کے مجھ پہ مگر
یہ اور بات ہے مجھ کو ستم ہی راس آئے

یہ حسن والے کسی کے کبھی نہیں ہوتے
جفا کے بدلے وفا کر کے ہم بھی پچھتائے

نہ جانے کون سی منزل پہ آ گیا ہوں میں
کہ جو قریب سے گزرے وہ مجھ سے کترائے
بھلا میں اور کا شکوہ ہی کیا کروں فیاضؔ
کہ اب تو بچنے لگے مجھ سے خود مرے سائے

غزل

اب تک تو یونہی زیست کے اوقات گزارے
پُر کیف تو بس چند ہی لمحات گزارے

جس طرح سے میں نے شبِ ہجراں کو گزارا
اس طرح تڑپ کر نہ کوئی رات گزارے

ہے یاد ہی اُن کی مری اب زیست کا حاصل
اے دوست ترے ساتھ جو لمحات گزارے

آنے سے ترے بھول گیا تلخیٔ ہجراں
مت پوچھ کہ کس طرح سے دن رات گزارے

منظور دل و جاں سے ہے فیاضؔ کو اے دوست
جو کچھ بھی تری چشمِ عنایات گزارے

غزل

نہ جانے کیوں دور دور سے ہیں وہ اتنے میرے قریب آکر
کہ کر رہے ہیں مجھی سے باتیں مگر کسی کو سُنا سُنا کر

چمن میں جب آشیاں بنایا تو برق نے اسکو پھونک ڈالا
میں پھر نشیمن بنا رہا ہوں مگر گلستاں سے دُور جا کر

یہ راہِ دیر و حرم ہے، کیا ہے، مجھے تو کچھ ہوش ہی نہیں ہے
نہ جانے کس سمت چل پڑا ہوں غمِ زمانہ سے تنگ آکر

یہ کب سے ارماں تھا میرے دل میں کہ بے نقاب اسکو دیکھوں لیکن
نہ ہو سکی تابِ دید مجھ کو جب اُس نے دیکھا نقاب اُٹھا کر

میں کل تلک مرکزِ نظر تھا اور آج قسمت نے یہ دکھایا
وہ کس بلندی سے دیکھتے ہیں نظر سے اپنی مجھے گرا کر
کھُلا کسی پر جو رازِ الفت نہ جینے دیگا تمہیں زمانہ
کسی سے فیاؔض کہہ نہ دینا یہ راز دل میں رکھو چھُپا کر

غزل

محفل سے اُن کی کل تو اُٹھایا گیا ہوں میں
پھر آج کیا ہوا جو بُلایا گیا ہوں میں

اتنا مجھے بتا تو سہی غلبۂ جنوں
آخر یہ کس مقام پہ لایا گیا ہوں میں

اُن کو تو اب بھی میری وفا کا نہیں یقیں
کس کس طرح سے گرچہ ستایا گیا ہوں میں

اب مثلِ اشک اُٹھ نہ سکوں گا زمیں سے
اس طرح اس نظر سے گرایا گیا ہوں میں

اتنا تو پوچھ لے کوئی اُس مستِ ناز سے
دیوانہ خود بنا کہ بنایا گیا ہوں میں
فیاضؔ جن کو بھول سکوں گا نہ میں کبھی
افسوس اُن کے دل سے بھلایا گیا ہوں میں

غزل

وہ وعدہ کر کے دلِ بے قرار بھول گئے
حضور آتے دمِ انتظار بھول گئے

ملے وہ آج مگر ایسے اجنبی بن کر
کہ جیسے سارے ہی قول و قرار بھول گئے

جنونِ عشق میں یہ کون سا مقام آیا
جہاں مجھے مرے سب غم گسار بھول گئے

وہ کیا گئے کہ بہاریں بھی ساتھ چھوڑ گئیں
ہم اُن کے جاتے ہی لطفِ بہار بھول گئے

ہے اُن کی یاد ہی فیاض زندگی میری
انھیں نہ بھولا وہ مجھ کو ہزار بھول گئے

غزل

کبھی اُن کی جفاؤں کو میں اکثر یاد کرتا ہوں
کبھی اپنی وفاؤں کو میں اکثر یاد کرتا ہوں

قفس میں اپنی تنہائی کا جب احساس ہوتا ہے
تو اپنے ہم نواؤں کو میں اکثر یاد کرتا ہوں

چلا کرتی تھیں جو اِس انقلابِ دہر سے پہلے
اب اُن دلکش ہواؤں کو میں اکثر یاد کرتا ہوں

کسی سے وہ ملاقاتیں وہ پھر دل پیار کی باتیں
انھیں رنگیں فضاؤں کو میں اکثر یاد کرتا ہوں

ترے پہلو سے اُٹھ آنا بھی گویا اک قیامت تھی
تری زلفوں کی چھاؤں کو میں اکثر یاد کرتا ہوں
جنھیں فیاض آنکھیں دیکھنے کو اب ترستی ہیں
کسی کی اُن اداؤں کو میں اکثر یاد کرتا ہوں

غزل

جب تازہ ستم وہ کبھی ایجاد کریں گے
مجھ کو یہ یقیں ہے کہ مجھے یاد کریں گے

دل کو وہ ہمیشہ کے لئے درد مِلا ہے
جبتک بھی جئیں گے تجھے ہم یاد کریں گے

تنگ آئے اگر وحشتِ دل سے تو کسی دن
جا کر کسی ویرانے کو آباد کریں گے

جب طاقتِ پرواز بھی باقی نہ رہے گی
اُس وقت وہ شاید مجھے آزاد کریں گے

زندہ ہوں تو احباب بھی ہیں مجھ سے گریزاں
مرجانے پہ دشمن بھی مجھے یاد کریں گے
فیاضؔ کوئی حد بھی تو ہو ضبطِ الم کی
کب تک نہ بھلا نالہ و فریاد کریں گے

غزل

توہینِ عشق ہم ہی گوارا نہ کرسکے
وہ آئے سامنے تو نظارا نہ کرسکے

بس اک جھلک نے کھو دیا نظروں کا اعتبار
کچھ دیر بھی ہم اُن کا نظارا نہ کرسکے

ان کے ستم بھی سہہ کے نہ کھینچا وفا سے ہاتھ
مجبور تھے ہم اُن سے کنارا نہ کرسکے

ہم نے ترے فراق میں گُھٹ گُھٹ کے جان دی
جینا ترے بغیر گوارا نہ کرسکے

ساحل سے دیکھتے تو رہے مجھ کو دُور تک
لیکن وہ لوٹنے کا اشارا نہ کر سکے
فیّاض اُن کی دید کو آنکھیں ترس گئیں
نظّارۂ جمال دوبارا نہ کر سکے

غزل

عشق مرانا کام نہیں ہے
مجھکو غمِ انجام نہیں ہے

صرف تمہاری یاد ہے میں ہوں
اور کسی سے کام نہیں ہے

میں نے خود ہی روگ لگایا
تم پہ کوئی الزام نہیں ہے

ایک نظر بس دیکھ لے ساقی
مجھکو شوقِ جام نہیں ہے

مجھکو امیدِ وصل اور اُن سے
کیا یہ خیالِ خام نہیں ہے
جس کی سحر ممکن ہی نہیں ہو
ایسی کوئی شام نہیں ہے
سب کچھ ہے فیاض میسّر
ایک فقط آرام نہیں ہے

غزل

رہے اسیرِ قفس آشیاں نہ دیکھ سکے
بھری بہار میں ہم گلستاں نہ دیکھ سکے

بس اک جھلک ہی نے بیہوش کر دیا ہم کو
ترے جمال کی رعنائیاں نہ دیکھ سکے

دل و جگر تپِ فرقت میں جل رہے ہیں مگر
کبھی نکلتا ہوا ہم دھواں نہ دیکھ سکے

ہمیں تو جب سے یہ ظلمت کدہ نصیب ہوا
کبھی ہم اپنی بھی پرچھائیاں نہ دیکھ سکے

ہزار طرح سے تدبیر کی دل ناشاد
مگر کبھی تجھے ہم شادماں نہ دیکھ سکے

رہِ طلب میں رکھے پاؤں جب سے اے فیاضؔ
جنونِ شوق میں سود و زیاں نہ دیکھ سکے

غزل

مجھے ایسا جینا گوارا نہیں ہے
کہ جس میں تمہارا سہارا نہیں ہے

میں یوں بحرِ غم میں بہا جا رہا ہوں
مقدّر میں جیسے کنارا نہیں ہے

بھٹکتی ہیں کب سے یہ بیتاب نظریں
میسّر جواں کا نظارا نہیں ہے

محبّت کے میداں میں ہی جیت اُسکی
جو مٹ کر بھی ہمّت کو ہارا نہیں ہے

مقدر میں میرے ہی بربادیاں تھیں
قصور اس میں کچھ بھی تمہارا نہیں ہے
کہیں کس کو فیاضؔ اپنا جہاں میں
کہ قسمت سے کوئی ہمارا نہیں ہے

غزل

بدلا بدلا اُن کا جو انداز ہے
درحقیقت اس میں کوئی راز ہے

ہر طرف رسوائیاں ہونے لگیں
اور ابھی تو عشق کا آغاز ہے

درحقیقت ہیں وہ جیسے سامنے
کیا تصوّر کی مرے پرواز ہے

ہے کرم جن کے لئے اُن پر رہے
مجھکو اُن کے ہر ستم پر ناز ہے

زندگی بھر غم نے چھوڑا ہی نہیں
صرف اک فیاضؔ یہ دمساز ہے

غزل

ٹکرا ہی گئی میری نظر اُن کی نظر سے
دھونا ہی پڑا ہاتھ مجھے قلب و جگر سے

اظہارِ محبّت نہ کیا بس اسی ڈر سے
ایسا نہ ہو گر جاؤں کہیں اُن کی نظر سے

اے ذوقِ طلب جوشِ جنوں یہ تو بتا دے
جانا ہے کہاں اور ہم آئے ہیں کدھر سے

اے اہلِ چمن صحنِ چمن سے قفس اچّھا
محفوظ تو ہو جائیں گے ہم برق و شرر سے

فیاضؔ اب آیا ہے جنوں جوش پہ اپنا
ہنستا ہے زمانہ میں گزرتا ہوں جدھر سے

غزل

حُسن کے جو دستور ہوئے
عشق کو سب منظور ہوئے
بدلی نظر جو ساقی کی
سب کے نشئے کافور ہوئے
حسن میں تو یکتا ہی سہی
عشق میں ہم مشہور ہوئے
اور محبّت بڑھتی گئی
جتنا وہ مجھ سے دُور ہوئے
حُسن تجلّی سے فیاض
دونوں جہاں معمور ہوئے

غزل

کرو گے کسی پر بھی جب تم جفائیں
بہت یاد آئیں گی میری وفائیں

کٹی ہے شبِ ہجر آنکھوں میں لیکن
سحر ہوتے ہوتے کہیں سو نہ جائیں

ترے ساتھ اے دوست گزرے جو اکثر
وہ لمحے بھلا کس طرح بھول جائیں

عجب کشمکش ہے سرِ بزم اُن کو
وہ مجھ کو بُلائیں کہ نظریں چُرائیں

کچھ اِس طرح وہ رُوٹھ کر چل دیے ہیں
کہ شاید تصور میں بھی اب نہ آئیں

زمانے کو بھولے ہیں ہم جن کی خاطر
یہ ممکن نہیں اب انھیں بھول جائیں

ترے ہجر میں اور تڑپا رہی ہیں
یہ بھیگی ہوائیں، یہ کالی گھٹائیں

یہ رودادِ الفت، یہ غم کا فسانہ
کوئی کب سُنے اور کسے ہم سُنائیں

مرے دل کو فیاض کھٹکا یہی ہے
کہ وہ وعدہ کرکے نہ پھر بھول جائیں

غزل

میں اُن کی دل سے چاہت کر رہا ہوں
بڑی بیباک جرأت کر رہا ہوں

چھپا کر اپنے غم کو اُن کے آگے
میں اظہارِ مسرت کر رہا ہوں

نہ جانے کیوں انھیں یہ وہم گزرا
کہ میں ترکِ محبت کر رہا ہوں

نہ نکلی کوئی حسرت میرے دل کی
میں اپنے دل پہ حسرت کر رہا ہوں

بسے ہو جب سے تم میری نظر میں
خیالِ ترکِ جنّت کر رہا ہوں
زمانہ اِس لئے برہم ہے مجھ سے
کہ میں تم سے محبّت کر رہا ہوں
ہر اک وعدے پہ اے فیاضؔ ان کے
بھروسہ در حقیقت کر رہا ہوں

غزل

نگاہِ لطف جو ہم پر وہ ایک بار کریں
تو جان صدقے کریں اُن پہ دل نثار کریں

بہار آئے پھر ایسی کہ تیرے دیوانے
جنوں کے جوش میں دامن کو تار تار کریں

پھر اس نے وعدہ کیا اب یہ سوچ ہے ہم کو
کہ اعتبار کریں یا نہ اعتبار کریں

یہ مشغلہ بھی غنیمت ہے ہم اسیروں کو
قفس میں بیٹھ کے نظارۂ بہار کریں

چمن پرست ہیں ہم سے تو یہ نہیں ہوگا
بچائیں کانٹوں سے دامن گلوں سے پیار کریں
بس اک جھلک ہی سرِ بام آ کے دکھلا دیں
جو تابِ دید پہ میری وہ اعتبار کریں
ہزار وعدہ شکن وہ سہی مگر فیاض
ہمیں تو پھر بھی یہ لازم ہے انتظار کریں

غزل

نظر ہم سے ملاتے جارہے ہیں
وہ دیوانہ بناتے جارہے ہیں
مبارک ہو تجھے اے جذبۂ دل
وہ اب نزدیک آتے جارہے ہیں
کھلا جاتا ہے سب پر رازِ الفت
جہاں تک ہم چھپاتے جارہے ہیں
گلستاں میں ہے شاید اُن کی آمد
جو غنچے مسکراتے جارہے ہیں

نہیں خواہش مجھے جام و سبو کی
وہ نظروں سے پلاتے جا رہے ہیں

خدا کے واسطے اب آ بھی جاؤ
ستارے جھلملاتے جا رہے ہیں

انھیں میری وفا کا جب یقیں ہے
تو پھر کیوں آزماتے جا رہے ہیں

مجھے فیاضؔ وہ جب بھول بیٹھے
تو پھر کیوں یاد آتے جا رہے ہیں

غزل

لیکے جاتی ہے کہاں اے آرزوئے دل مجھے
وہ سمجھتے ہی نہیں جب لائق محفل مجھے

بچ کے طوفانوں سے کشتی جب کنارے پر لگی
دیر تک تکتا رہا ساحل کو میں ساحل مجھے

مجھ پہ اب ظلم و ستم جور و جفا کچھ بھی کریں
شکر ہے آخر وہ سمجھے تو کسی قابل مجھے

تلخیاں ایسی غمِ دوراں نے بخشیں ان دنوں
کر دیا یادِ غمِ جاناں سے بھی غافل مجھے

مائلِ لطف و کرم فیاض ان کو دیکھکر
آج جذبِ عشق کا ہونا پڑا قائل مجھے

غزل

ربط اُن سے بڑھا کے دیکھ لیا
روگ دل کو لگا کے دیکھ لیا

ضبطِ غم آزما کے دیکھ لیا
یعنی خود کو مِٹا کے دیکھ لیا

کوئی اپنا نہیں زمانے میں
سب کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

ہو سکے گی نہ اُن کو قدرِ وفا
ہم نے خوب آزما کے دیکھ لیا

رازِ الفت نہ چھپ سکا ہم سے
ہم نے سب سے چُھپا کے دیکھ لیا
سب گِلے دل سے مٹ گئے فیاضؔ
اُس نے جب مُسکرا کے دیکھ لیا

غزل

ہے جنوں کی یہ کارفرمائی
ہو چلی خوب اپنی رُسوائی
مر مٹا تجھ پہ تیرا شیدائی
یہ تمنّا تو اس کی بر آئی
اپنے بیمار کی خبر بھی نہ لی
دیکھ لی آپ کی مسیحائی
یادِ جاناں تجھے خدا رکھے
صرف تو ہے رفیقِ تنہائی

بارہا جس کو بھولنا چاہا
مجھکو پیہم اُسی کی یاد آئی
ضبط سے کام لو ذرا فیاضؔ
عشق اور اُس پہ ناشکیبائی

غزل

کم نہیں میری زندگی کے لئے
چین مل جائے دو گھڑی کے لئے

اے دلِ زار کون ہے تیرا؟
کیوں تڑپتا ہے تو کسی کے لئے

تلخیٔ مے قبول کی میں نے
صرف تھوڑی سی بے خودی کے لئے

اور کیا چاہیئے ثبوتِ وفا
مٹ گئے ہم تری خوشی کے لئے

کتنے ساماں کر لئے پیدا
اتنی تھوڑی سی زندگی کے لئے
ایسا فیاضؔ غم نے گھیرا ہے
لب ترس ہی گئے ہنسی کے لئے

غزل

جانے والے نے میری خوشی چھین لی
دے گیا اشکِ غم اور ہنسی چھین لی

کل جو بخشی تھی تم نے نئی زندگی
آج مجھ سے وہی زندگی چھین لی

ہو کے برہم جو ساقی نے دیکھا مجھے
میرا نشہ مری بے خودی چھین لی

میرے رونے پہ وہ مسکراتا رہا
جس نے میرے لبوں کی ہنسی چھین لی

جل رہے تھے اُمیدوں کے لاکھوں دیئے
نا اُمیدی نے سب روشنی چھین لی
ان کی غفلت نے فیاض دل سے مرے
تھی جو جینے کی وہ آس بھی چھین لی

غزل

رفعتِ کون و مکاں سے دُور ہوں
یعنی اُن کے آستاں سے دُور ہوں

بُوئے گُل سے مست ہیں اہلِ چمن
ایک میں ہی گلستاں سے دُور ہوں

میں جہاں ہوں وہ جہاں ہی اور ہے
اس زمیں اس آسماں سے دُور ہوں

تجھ سے اب ملنا مرا دُشوار ہے
تو جہاں ہے میں وہاں سے دُور ہوں

ڈھونڈتا ہے کیوں مجھے فیاضؔ وہ
جس کے میں وہم و گماں سے دُور ہوں

غزل

کسی پہ ہو نہ عیاں راز آشنائی کا
تو رہ سکے گا بھرم اپنی پارسائی کا

قفس میں قید ہوں موقع نہیں رہائی کا
ملا ہے مجھکو یہ انعام خوشنوائی کا

مری وفاؤں میں ہوگی ضرور کوئی کمی
مجھے ملال نہیں اُن کی کج ادائی کا

یہ آج جان لیا ہم نے ہجر کیا شے ہے
سُنا ہی کرتے تھے قصّہ شبِ جدائی کا

شعاعِ حسن سے دم بھر میں جل کے خاک ہوا
جو ہم نے قصر بنایا تھا پارسائی کا
حضورِ حسن کہاں اور ہم کہاں فیاض
ہمیں تو وہم و گماں بھی نہ تھا رسائی کا

غزل

اُن کے چہرے پہ کیا شباب آیا
اَوج پر جیسے آفتاب آیا
ایک تیری نظر کے پھرتے ہی
میری دنیا میں انقلاب آیا
تابِ دیدار ہو سکی نہ مجھے
سامنے جب وہ بے نقاب آیا
اُن سے بچھڑا ہوں جب سے آنکھوں میں
نیند آئی نہ کوئی خواب آیا

میرے قاصد کا بھی جواب نہیں
جب گیا ہو کے لا جواب آیا
اُس ستمگر پہ جانے کیوں فیّاض
یہ دلِ خانماں خراب آیا

غزل

میری الفت کو ٹھکرا دیا
یہ وفاؤں کا بدلا دیا

ہم کریں عزمِ ترکِ وفا؟
آپ نے کیا یہ فرما دیا

میرے کہنے میں اب دل نہیں
جانے کیا تم نے سمجھا دیا

شکریہ تیرا جوشِ جنوں
بزم تک اُن کی پہنچا دیا

ہائے مستی بھری وہ نظر
قلب کو جس نے برما دیا
جب بھی چاہا اُنھیں بھولنا
درد نے اور تڑپا دیا
خود سفینے کو فیاؔض نے
بڑھ کے طوفاں سے ٹکرا دیا

غزل

حبِ وفا ہی نہیں زمانے میں
پھر مزا کیا ہے دل لگانے میں

آتشِ غم نے دل جلا ڈالا
لگ گئی آگ آشیانے میں

جانے کیوں دل دھڑکنے لگتا ہے
اب کسی سے نظر ملانے میں

تیری صورت کا واہ کیا کہنا
کوئی ثانی نہیں زمانے میں

عشق کا راز ہائے مت پوچھو
اور کھلتا گیا چھپانے میں
کس کو فیاضؔ ہم کہیں اپنا
کوئی اپنا نہیں زمانے میں

غزل

زندگی اور بھی دشوار ہوئی جاتی ہے
اب تو ہر سانس اک آزار ہوئی جاتی ہے

بن کہے رازِ محبت ہے زمانے پہ عیاں
خامشی بھی مری گفتار ہوئی جاتی ہے

صاف انکار کیا وصل سے تو نے لیکن
مسکراہٹ تری اقرار ہوئی جاتی ہے

کبھی ڈرتا ہوں گراں گزرے نہ انکو مری بات
اور کبھی جراٴتِ اظہار ہوئی جاتی ہے

اُن کے آنے کی خبر سُن کے نہ جانے اس دم

تیز کچھ قلب کی رفتار ہوئی جاتی ہے

ضبط کی حد سے گزرتے ہی محبت اپنی

خوب رُسوا سربازار ہوئی جاتی ہے

اُن کی معصوم نظر تھی کبھی فیاض مگر

اب تو عالم سے خبردار ہوئی جاتی ہے

غزل

موسمِ گل اور یہ تنہائی
جانِ بہاراں تیری دہائی
شبنم نے کیا بات سنائی
لینے لگے غنچے انگڑائی
برسوں ہم جھومیں گے ساقی
تو نے نظر سے ایسی پلائی
کوئی کسی کا کب ہوتا ہے
چھوڑ بھی اے دل آس پرائی

وصل ہے تیرا جنّت مجھکو
اور جہنّم تیری جدائی

ہردم اُن کی یاد آتی ہے
جن کو ہماری یاد نہ آئی

اُن سے گلہ فیاضؔ کروں کیا
مجھکو وفا خود راس نہ آئی

غزل

جو راز ہمارے دل میں ہے اس راز کو آخر جان گئے
ہم لاکھ زباں سے کہہ نہ سکے لیکن وہ نظر پہچان گئے

جو کرتے رہے کل تک ہم پر ہر ظلم و ستم ہر جور و جفا
ہیں آج وہی مائل بہ کرم اے عشق ترے قربان گئے

اک بار نگاہِ لطف اگر ہوتی تو یہ حسرت مٹ جاتی
اکثر تو کسی کی محفل میں ہم لے کے یہی ارمان گئے

فیاض ہمیں بتلاؤ تو دنیا میں کہاں ہے قدرِ وفا
تم ڈھونڈ رہے ہو اب جن کو ہیں دور سے وہ انسان گئے

غزل

جاتے ہو آسرا دِلا کے مجھے
بھول جانا نہ دُور جا کے مجھے

اِس شرارت کا کچھ جواب بھی ہے
کس قدر خوش ہیں وہ ستا کے مجھے

تم سے اتنی ہی عرض ہے میری
مت رُلانا کبھی ہنسا کے مجھے

دُور سے چھیڑ میں مزا کیا ہے
چھیڑنا ہے تو پاس آ کے مجھے

ہیں مخاطب وہ غیر سے لیکن
کہہ رہے ہیں سُنا سُنا کے مجھے
خود تو کرتے ہیں وہ ستم پہ ستم
طعنے دیتے ہیں اور وفا کے مجھے
یہ ادا اُن کی بھا گئی فیاضؔ
جب دیا پان مسکرا کے مجھے

غزل

حسن جب خوگرِ جفا نہ رہا
پھر محبت میں کچھ مزا نہ رہا

مجھ کو جب تیرا آسرا نہ رہا
دل میں پھر کوئی مدّعا نہ رہا

کیسی بے درد ہو گئی دُنیا
ایک بھی درد آشنا نہ رہا

خاک اُن سے رکھوں امیدِ کرم
جب ستم کا بھی آسرا نہ رہا

اپنے حالِ تباہ کے صدقے
آشنا بھی تو آشنا نہ رہا
ساری دُنیا ہے بیوفا فیاضؔ
اب یہاں کوئی باوفا نہ رہا

غزل

ستم کرنے والے کرم کیا کریں گے
وفا وہ کریں گے تو ہم کیا کریں گے

ہماری محبّت گوارا نہیں ہے
تو پھر حُسن کا یہ صنم کیا کریں گے

مرے حالِ برباد پر ہنسنے والے
مجھے دیکھ کر چشم نم کیا کریں گے

جفا کرنے والے ستم ڈھانے والے
بھلا میرے مٹنے کا غم کیا کریں گے

تری چاہ میں ہم نے دُنیا لُٹا دی
تری چاہ اب دل سے کم کیا کریں گے
نہ تھا وصل فیاضؔ قسمت میں اپنی
اب اُن سے شکایت بھی ہم کیا کریں گے

غزل

یہ جو مہمان بنے بیٹھے ہیں
میرا ایمان بنے بیٹھے ہیں

ہم سے مت پوچھئے رُودادِ الم
غم کا طوفان بنے بیٹھے ہیں

مجھکو رُسوائے زمانہ کر کے
آپ انجان بنے بیٹھے ہیں

ہائے یہ آپ کا رنگین شباب
حُسن کی آن بنے بیٹھے ہیں

میرے مِٹنے کا انھیں بھی غم ہے
وہ پریشان بنے بیٹھے ہیں
اپنا رُخ دیکھ کے آئینے میں
خود وہ حیران بنے بیٹھے ہیں
اُن کی تعریف کروں کیا فیاض
عشق کی جان بنے بیٹھے ہیں

غزل

تنکے چنتا ہوں ہیں برق ہی تاک میں اب نشیمن بنایا تو جل جائیگا
پھر بھی ارمان رہ جائے دل میں مرے کم سے کم حوصلہ تو نکل جائیگا

عشق پر ناز بیجا نہیں ہے مجھے حسن فانی ہے اور عشق فانی نہیں
حسن والوں کو کس بات پر ناز ہے حسن اُن کا تو کچھ دن میں ڈھل جائیگا

جس نے مجھ سے ملا کر نظر پھیر لی جس نے میری وفا کی نہ کچھ قدر کی
اب دیکھوں گا میں بھول کر اک نظر اُس کو دیکھا تو پھر دل مچل جائیگا

میں نے فرقت کی راتیں جدائی کے دن کس طرح سے گزارے ہیں مت پوچھئے
کیا سناؤں تمہیں ہجر کی داستاں جب سنو گے کلیجہ دہل جائیگا

رہ گئے گھٹ کے ارمان دل میں مرے غم کے سانچے میں یہ زندگی ڈھل گئی
یہ کبھی میں نے فیاض سوچا نہ تھا دفعتہً مجھ سے وہ یوں بدل جائیگا

غزل

جام آنکھوں سے پلاؤ تو سہی
مجھکو مدہوش بناؤ تو سہی

ہم سے نظریں تو ملاتے ہو مگر
دل کو بھی دل سے مِلاؤ تو سہی

تم سے دوری کا بہت ہی غم ہے
آکے اِس غم سے چھڑاؤ تو سہی

سو چکیں تھک کے جو دل میں میرے
اُن اُمنگوں کو جگاؤ تو سہی

کیوں مِلاتے نہیں آنکھیں مجھ سے
بات یہ کیا ہے بتاؤ تو سہی
وہ ضرور آئیں گے فیاض اک دن
تم اُنھیں دل سے بُلاؤ تو سہی

غزل

دل میں اک سوزشِ نہاں کے سوا
تیرا غم ہے غمِ جہاں کے سوا
لب پہ نغمے کہاں فغاں کے سوا
یادِ گُل رہ گئی خزاں کے سوا
یہ جبیں آج تک کہیں نہ جھکی
آپ کے سنگِ آستاں کے سوا
اب کہیں بھی تو کیا کہیں اُن سے
حالِ ناقابلِ بیاں کے سوا

یہ بہاریں تو چار دن کی ہیں
کچھ نہ پاؤ گے پھر خزاں کے سوا
کچھ مداوائے غم نہیں فیاضؔ
اب تو اک مرگِ ناگہاں کے سوا

غزل

میں جو رُوٹھا تو منانے آئے
شاید اب ہوش ٹھکانے آئے

ہو کے مجبور آج تیرے حضور
غم کی رُوداد سُنانے آئے

ہو گئیں درپئے آزار تو پھر
کون تسکین دِلانے آئے

جب میں جانوں کہ مری طرح کوئی
یوں ترے ناز اُٹھانے آئے

دوستوں نے بھی چُرالیں نظریں
مجھ پہ ایسے بھی زمانے آئے
یادِ ماضی ہے غنیمت فیاض
لوٹ کر کس کے زمانے آئے

غزل

کچھ اس طرح وہ گئے کر کے بیقرار مجھے
کہ چین مل نہ سکا ہائے ایک بار مجھے
کبھی تو بھولونگا میں تجھکو بھولنے والے
کبھی تو ہو گا مرے دل پہ اختیار مجھے
ہزار مجھ سے محبت سہی تمہیں لیکن
نہ دیکھا پیار سے افسوس ایک بار مجھے
یہ کیا کیا جو نشیمن بنا لیا میں نے
کہ برق پھر نظر آتی ہے بے قرار مجھے

نہ آسکا پس وعدہ تو کوئی بات نہیں
رہیگا حشر تلک تیرا انتظار مجھے
نگاہ پھیر لی فیاض دفعتہً اُس نے
یہی خیال ستاتا ہے بار بار مجھے

غزل

یقیناً خوب ہیں وہ خوب تر سے
اُنھیں دیکھے کوئی میری نظر سے

اُنھیں یوں تو ہزاروں بار دیکھا
بچا کر اہلِ محفل کی نظر سے

کوئی میرا ٹھکانہ ہی نہیں ہے
کہاں جاؤں میں اُٹھ کر تیرے در سے

تری چارہ گری کس کام آئی
کوئی پوچھے تو میرے چارہ گر سے

تڑپ کر رات کاٹی ہے کسی نے

ستارے کہہ رہے ہیں یہ سحر سے

کیا بدحال مجھکو کچھ جنوں نے

رہے اور آپ بھی کچھ بے خبر سے

پڑے ہیں راہ میں فیاضؔ اُن کی

کہ شاید وہ کبھی گزریں اِدھر سے

غزل

جیسے جیسے وہ قریب آتے گئے
اہلِ دُنیا مجھ سے کتراتے گئے

تیری محفل کی وہی رونق رہی
لوگ کچھ جاتے رہے آتے گئے

صبح غنچوں کے لبوں پر تھی ہنسی
شام آئی پھُول کمھلاتے گئے

جس قدر کرتے گئے محرومِ دید
شوق کو وہ اور بھڑکاتے گئے

مجھکو اے فیاضؔ دل کے ولولے
کیسے کیسے رنگ دکھلاتے گئے

غزل

بہتا گیا سفینہ مخالف ہوا کے ساتھ
مجبور دیکھتے رہے ہم ناخدا کے ساتھ

آخر کوئی نباہ کی صورت تو چاہیئے
لطف و کرم بھی کیجئے جور و جفا کے ساتھ

میں بن پئے ہی بے خود و مدہوش ہو گیا
ساقی نے مجھ کو دیکھ لیا کس ادا کے ساتھ

ناصح بجا ہی کہتے ہیں لیکن میں کیا کروں
اک ربطِ خاص ہے مجھے اُس بیوفا کے ساتھ

فیاضؔ میں نے بزم میں دیکھا جو اک نظر
انکی نگاہ جھک سی گئی شرم و حیا کے ساتھ

غزل

چھوڑ کر کیا وہ گل عذار گیا
جیسے اب موسم بہار گیا
ہے خوشی مجھ کو ان کے آنے کی
ہاں مگر لطفِ انتظار گیا
آپ کو سونپ دی امانتِ دل
اب ہمارا تو اختیار گیا
دل کے جانے کا رنج ہے مجھکو
تھا جو اک وہ بھی غم گسار گیا

دے مرے عشق کو دُعائے دوست
جو ترے حُسن کو نکھار گیا

پوچھتے کیا ہو ہجر کا عالم
جیسے گزرے ہیں دن گزار گیا

اُس کا جانا نہ پوچھئے فیاضؔ
دل کی ہر چوٹ کو اُبھار گیا

غزل

سوزِ دل کا نہ مِٹے گا مجھے معلوم نہ تھا
درد رہ رہ کے اُٹھے گا مجھے معلوم نہ تھا
جس کی خاطر میں زمانے کو بھلا بیٹھا ہوں
وہ خبر تک بھی نہ لے گا مجھے معلوم نہ تھا
بجلیاں کوندرہی تھیں تو چمن میں لیکن
آشیاں میرا جلے گا مجھے معلوم نہ تھا
وہ تصوّر کی نگاہوں سے بھی اوجھل ہو کر
میرے ہی دل میں رہے گا مجھے معلوم نہ تھا

پا کے موجوں کا سہارا ابھی سفینہ میرا
غرقِ طوفاں ہی رہے گا مجھے معلوم نہ تھا

میں نے ہر چند زمانے سے چھپانا چاہا
رازِ الفت نہ چھپے گا مجھے معلوم نہ تھا

ٹھوکریں کھاتا ہوں منزل سے بچھڑ کر فیاضؔ
کارواں ساتھ نہ دے گا مجھے معلوم نہ تھا

چاندنی رات ہے

چاندنی رات ہے تنہائی ہے
مجھکو اس دم تری یاد آئی ہے

دفعتہً چاند پہ ٹھہری جو نظر
بس اسی سوچ میں کھویا ہوں میں

کوئی پرسان نہیں اس دم میرا
اپنی تنہائی پہ رویا ہوں میں

چاندنی رات ہے تنہائی ہے
مجھکو اس دم تری یاد آئی ہے

چاندنی چاند کے ہمراہ رہے
یہ سماں دیکھ کے رنجور رہوا
میری دُنیا میں اندھیرا چھایا
میرے محبوب جو تو دُور رہوا

چاندنی رات ہے تنہائی ہے
مجھکو اُس دم تری یاد آئی ہے

آندھیاں یاس کی چلتی ہی رہیں
شمعِ اُمید جلاتا ہی رہا
تو ضرور آئے گا یہ کہہ کر
دل کو تسکین دلاتا ہی رہا

چاندنی رات ہے تنہائی ہے
مجھکو اس دم تری یاد آئی ہے

چاندنی رات میں تو یاد آیا
دل میں اک ٹیس کا احساس ہوا

آج بھی دور ہے مجھ سے اے دوست

آج بھی تو نہ مرے پاس ہوا

چاندنی رات ہے تنہائی ہے

مجھکو اسدم تری یاد آئی ہے

میرے محبوب جو تو آ جائے

چمکے قسمت مرے کاشانے کی

مست نظروں سے پلا دے آکر

پھر ضرورت نہیں پیمانے کی

چاندنی رات ہے تنہائی ہے

مجھکو اسدم تری یاد آئی ہے

دُور تک دیکھتا جاتا ہوں مگر

لوٹ آتی ہیں نگاہیں خالی

میرا آغوش ہے سُونا سُونا

کب سے ہیں یہ مری باہیں خالی

چاندنی رات ہے تنہائی ہے
مجھکو اسدم تری یاد آئی ہے

چاندنی ہو چلی پھیکی پھیکی
ہونیوالی ہے سحر آ بھی جا
راہ تکتا ہوں میں کب سے تیری
تھک چلی میری نظر آ بھی جا

چاندنی رات ہے تنہائی ہے
مجھکو اسدم تری یاد آئی ہے

کیف و سرور

وہ دَور اب بھی کبھی یاد آہی جاتا ہے

غریقِ بادۂ کیف و سرور رہتا تھا
ہر ایک رنج و مصیبت سے دور رہتا تھا
کسی کی مست نظر سے مِلا مِلا کے نظر
عجیب طور سے نشّے میں چُور رہتا تھا

وہ دَور اب بھی کبھی یاد آہی جاتا ہے

مجھے تو شمس و قمر کا بھی کوئی ہوش نہ تھا
کہ کب طلوع ہوئے اور ہوئے غروب وہ کب

مرے خیال کی دُنیا تجھی سے تھی آباد
ترے سوا مجھے دنیا سے کچھ نہ تھا مطلب
وہ دور اب بھی کبھی یاد آ ہی جاتا ہے

وہ میرے سامنے جب بے نقاب ہوتا تھا
مرے خطاب سے پہلے خطاب ہوتا تھا
وہ میرے حال کو سن کر خموش ہو جانا
کہ خامشی سے بھی پیدا جواب ہوتا تھا
وہ دَور اب بھی کبھی یاد آ ہی جاتا ہے

ہزار کوہِ الم کو عبور کرتا ہوں
ہزار غم کو طبیعت سے دور کرتا ہوں
رواں ہیں عہدِ گزشتہ کی یاد میں آنسو
اگرچہ ہنسنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں
وہ دور اب بھی کبھی یاد آ ہی جاتا ہے

قطعہ

دل سے جو کوئی عجز کو اپناتا ہے
وہ سب کی نگاہوں میں جگہ پاتا ہے
ہو کر کوئی مغرور اُٹھاتا ہے جو سر
دُنیا کی نظر سے وہی گِر جاتا ہے

قطعہ

حضور آپ نے عہدِ وفا جو باندھا تھا
مجھے یقیں نہیں آتا کہ آپ بھول گئے
اگر یہ سچ ہے تو بے حد ملال ہے اس کا
کہ زندگی کے وہ لمحات بھی فضول گئے

قطعہ

ایک مدّت پہ ہوئی اُن سے ملاقات مگر
تشنگی رہ گئی وہ بات نہ ہونے پائی
مل کے بھی دل میں ہمارے یہی ارمان رہا
اُن سے جی بھر کے ملاقات نہ ہونے پائی

قطعہ

ہر ایک گل مری آنکھوں میں خار ہے آ جا
لٹی لٹی سی چمن کی بہار ہے آ جا
ترے لئے میں بہت بیقرار ہوں اے دوست
کہ مجھ کو کب سے ترا انتظار ہے آ جا

قطعہ

میرے ارمان بھرے دل کو دُکھانیوالے
تو کہاں ہے مری نیندوں کو اُڑانیوالے
آنکھیں پتھرا گئیں بس اور نہ ترسا ظالم
اب تو آجا مجھے راتوں کو جگانے والے

قطعہ

تڑپتے دل کو نہ میرے کبھی قرار ملا
مرا نصیب کہ مجھ کو نہ تیرا پیار ملا
جو کچھ ملا تو فقط یہ ملا محبّت میں
شبِ فراق ملی، دردِ انتظار ملا

قطعہ

تڑپ کے مجھ کو دلِ بے قرار نے مارا
کہ تیری یاد دلا کر بہار نے مارا
ارے او وعدہ فراموش آ بھی جا اللہ
کہ اب تو مجھ کو ترے انتظار نے مارا

ضمیمہ

غزل

بن گئی اپنی چاہ کی صورت — رفتہ رفتہ گناہ کی صورت
کب سے ارماں ہی کوئی نکلے تو — آپ سے رسم و راہ کی صورت
کام ابرو نے بھی کیا اپنا — انکی ترچھی نگاہ کی صورت
میرا دل ہو کے انکی کہتا ہے — دیکھئے اس گواہ کی صورت
کرم بیحساب بھی مجھ پہ — ستم بے پناہ کی صورت
آج ہی ترکِ آہ کرتا ہوں — سوچیئے ترکِ آہ کی صورت
آپ للہ مجھ کو بتلائیں — زندگی سے نباہ کی صورت
سُن کے رودادِ رنج و غم افسوس — واہ کی اس نے آہ کی صورت
دل کو چین آج تک کہیں نہ ملا — آپکی جلوہ گاہ کی صورت

ختم ہوتی چلیں اُمیدیں بھی
دل صرفِ نگاہ کی صورت

ایسا لگتا ہے اب بدلے گی
میرے حالِ تباہ کی صورت

غیر آئے ہیں مجھ کو سمجھانے
ہائے رے خیر خواہ کی صورت

آپ چاہیں تو کیا نہ نکلے گی
میرے عفوِ گناہ کی صورت

شیخ جی میکدے میں آئے ہیں
ایک عالم پناہ کی صورت

میرے ظلمت کدے میں کاش اک دن
آئیں وہ مہر و ماہ کی صورت

ایک جادو ہے ہر ادا فیاضؔ
اُن کی چشمِ سیاہ کی صورت

غزل

برباد کچھ اِس طرح ہوا عشقِ بُتاں میں
اب کوئی ٹھکانا ہی نہیں میرا جہاں میں

کہتا نہ تھا یوں ترکِ محبّت کی نہ ٹھانو
اب دونوں گرفتار ہیں بیتابیٔ جاں میں

خوش ہو کے سُنی غیر کی تعریف بھی میں نے
ہے ایسی حلاوت ترے اندازِ بیاں میں

پھولوں نے بہاروں میں کبھی منھ نہ لگایا
کانٹے تو نہ چھوڑیں گے دامن کو خزاں میں

ہے مجھ سے زمانہ جو گریزاں تو گلہ کیا
کیا رکھا ہے دُنیا کے لئے بارِ گراں میں

فرہاد پہ یا قیس پہ موقوف نہیں کچھ
بیٹھے ہیں سبھی تھک کے رہِ عشقِ بُتاں میں

فیاضؔ سے مل کر ہوئے مسرور بہت ہم
اِس وضع کے کچھ لوگ ابھی باقی ہیں جہاں میں

قطعہ

عشق کے اظہار سے کیا فائدہ
مفت کے آزار سے کیا فائدہ
کیجیے تو عمر بھر کے واسطے
چار دن کے پیار سے کیا فائدہ

قطعہ

رشک آتا ہے اُن کی قسمت پر
قرب جن کو ترا میسّر ہے
تیری آغوش میں پناہ ملے
میرا ایسا کہاں مقدّر ہے

متفرق اشعار

○

وہ ضرور آئیں گے جب تجھکو یقیں ہے اے دل
پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ دھڑکتا کیوں ہے

○

جذبۂ دل میں ہے تاثیر تو فیاض اک دن
روٹھنے والے خود آئیں گے منانے کے لئے

○

نگہِ مست سے وہ مجھ کو مے پلا ساقی
کہ عمر بھر کبھی اک لمحہ ہوش آ نہ سکے

○

تھا کبھی گُم کردۂ منزل مگر
آج تو آسودۂ منزل ہوں میں

○

نشے میں چُور ہوں فیاضؔ اسقدر پی ہے
زمانہ اب بھی سمجھتا ہے ہوشیار مجھے

○

تیری فرقت کے دن معاذاللہ
جیسے صدیاں گزار دیں میں نے

○

نباہ چاہا تھا فیاضؔ زندگی سے مگر
کوئی نباہ کی صورت نظر نہیں آتی

○